OSHO

گرو رجنیش کی شہرہ آفاق کتاب "SEED OF WISDOM" کا ترجمہ

عقل و شعور

اوشو (گرو رجنیش)

سید علاؤالدین

عقل و شعور

اوشو (گرو رجنیش)
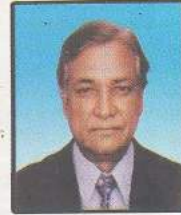
مترجم سید علاؤالدین مولانا شبلی نعمانی کی سرزمین ضلع اعظم گڑھ یوپی بھارت میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے پہلے عشرے کے ابتدائی برسوں میں پاکستان آگئے۔ کراچی یونیورسٹی سے M.A سیاست اور اسکے بعد M.A صحافت کی اسناد حاصل کیں۔ نیشنل بینک میں ملازمت کے دوران بینکنگ کا اعلیٰ ترین ڈپلومہ D.A.I.B.P. حاصل کیا اور A.V.P. کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ سٹی بک پوائنٹ کو انکی ترجمہ کی ہوئی کتب کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔

اینیمل فارم (جارج آرویل)	چارلس ڈارون کی خودنوشت	چور اور کتے (نجیب محفوظ)
خوش رہنے کا فن (دلائی لامہ)	تساوو کے آدم خور (کرنل جے ایچ پیٹرسن)	عام سے لوگ (نجیب محفوظ)
گرو رجنیش حالاتِ زندگی (وسنت جوشی)	الکیمسٹ (پاؤلو کوئیلہو)	ویرونیکا کی خودکشی (پاؤلو کوئیلہو)
حضرت سلیمان کا خزانہ (رائڈر ہیگرڈ)	شیکسپئر کہانیاں (ولیم شیکسپئر)	عظیم وراثت (چارلس ڈکنز)

گرو رجنیش جنھیں عام طور پر اوشو کے نام سے جانا جاتا ہے ہندوستان کی ایک متنازعہ شخصیت میں شمار کیے جاتے ہیں۔ گرو رجنیش ایک ماہر فلسفی تھے لیکن انھوں نے اپنی شخصیت کو ایک خاص طرزِ فکر کی بنیاد پر متعارف کرایا جس کی وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ گرو رجنیش کو یہ صلاحیت حاصل تھی کہ وہ کسی شخص کی نفسیاتی کیفیات اور اس کی گفتگو کا اندازہ لگا کر اس کے سوالوں کے جواب دے دیا کرتے تھے۔ گرو رجنیش کی شخصیت کی چالاکی کا اندازہ اس بلمت سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے متضاد بیانات کے ذریعے لوگوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

گرو رجنیش کی بنیادی تعلیمات دائمی خوشی کے حصول سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کے لئے ان کا فلسفہ یہ ہے کہ دائمی خوشی کے حصول کے لئے کسی بھی انسان کا طریقہ کار مکمل طور پر علیحدہ ہوتا ہے اس لئے اگر کسی کو کوئی بھی طریقہ کار اختیار کر کے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ اس طریقہ کار کو فوری طور پر اپنا لے۔ گرو رجنیش کی تعلیمات کی بنیاد بدھ مت اور جین مت پر رکھی گئی ہے اس لئے وہ بدھ مت اور جین مت کے مطابق مراقبہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ گرو رجنیش نے روحانیت کے حصول کے لئے ایک آشرم بھی قائم کیا تھا جو ہندوستان میں آج بھی قائم ہے اور اس جگہ سے گرو رجنیش کی تعلیمات کے فروغ کا سلسلہ جاری ہے۔

گرو رجنیش کی شہرہ آفاق کتاب seeds of wisdom کا اردو ترجمہ

تصنیف: گرو رجنیش (اوشو)

ترجمہ: سید علاء الدین

CITY BOOK POINT

Naveed Square.
Urdu Bazzar, Karachi
Ph # 021-2762483 Cell # 0322-2820883
E-Mail: citybookurdubazaar@gmail.com

• باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

نام کتاب: عقل وشعور
ترجمہ: سید علاءالدین
ناشر: سٹی بک پوائنٹ
تعداد: 500
اشاعت سن: 2012ء
قیمت: =/250 روپے

انتساب

پیاری اور دلاری فاطمہ تابش
اور
عشال ارشد کے نام

دعا ہے کہ پروردگار انہیں خوشیوں بھری زندگی عطا فرمائے آمین۔

مترجم

کچھ مصنف کے بارے میں

ہندوستان کی ایک انتہائی متنازعہ شخصیت جس سے اسکے ہزار ہاشاگرد بے پناہ محبت کرتے تھے جبکہ اس سے بڑی تعداد شدید مخالفت کیا کرتی تھی ۔ وہ ایک گروتھا اور گرو رجنیش کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ اسکے ساتھ وہ اوشو بھی کہلاتا تھا۔ اسکے شاگرد نہ صرف اسے بھگوان کی حیثیت دیتے تھے بلکہ بھگوان ہی کہہ کر پکارتے تھے ۔ ہندوستان میں اس بات کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا چنانچہ مذہبی اشخاص اس سے برگشتہ تھے لیکن خود رجنیش اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے ۔ ہندوستان میں بھگوان کی اصطلاح کا سادہ سا مفہوم ہے یعنی ایک ایسا شخص جس پر خدا کی رحمتیں ہوں۔(the blessedone) جو خوش قسمتی سے خود کو پہچانتا ہو۔ اسکا دنیا کی تخلیق سے کوئی واسطہ نہیں ۔ ایک بار اس سے سوال کیا گیا کہ تم خود کو بھگوان کیوں کہلواتے ہو؟ اسکا جواب تھا ''کیونکہ میں ہوں کیونکہ تم بھی ہو''۔

وہ مذہب کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اسکی توضیح نرالے انداز میں کیا کرتا تھا۔ اسکا کہنا تھا کہ لوگ جسے مذہب سمجھتے ہیں وہ مذہب نہیں ہے ۔لوگ جسے عبادت سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک بے معنی اور غیر معقول رویہ ہے ۔ وہ جسے سنیاس کہتے ہیں وہ میرے لئے فرار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ۔ وہ جسے صحیفہ سمجھتے اور جس کے تحت اپنے سروں کو جھکاتے ہیں وہ میرے نزدیک ایک معمولی سی کتاب ہے ۔جن باتوں پر انہیں یقین کامل ہے وہ میرے لئے غیر یقینی اور شبہات سے پر ہیں۔

کسی نے اس سے سوال کیا کہ تم کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ میں ایک مذہبی شخص ضرور ہوں لیکن میرا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ بہت سارے مذاہب ہیں لیکن میں کسی مذہب کو نہیں سمجھ پایا۔

لیکن اگر اس کے افکار و خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ وہ مذہب سے بے تعلق ہوتے ہوئے بھی ایک کٹر خدا پرست شخص ہے۔ وہ سچائی اور حقیقت تک پہنچنے

کے بہت سے طریقے بیان کرتا ہے اور سچائی اور حقیقت سے اسکی مراد وہی ذات عظیم ہے جس نے کائنات کی تخلیق کی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس کے نظریات خصوصاً مذہب ، خدا اور سیکس وغیرہ بجا طور پر ناپسند دیدہ فکر سمجھی گئی بلکہ سخت ترین تنقید بھی ہوئی اتنی کہ اسپر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ بال بال بچا۔ اسکے قائم کردہ کمیون، مراقبہ سنٹر اور لائبیریری وغیرہ کو نذر آتش کردیا گیا لیکن یہ بات حیرت انگیز رہی کہ وہ اپنی روش پر قائم رہا اور لوگوں کی کثیر تعداد اس کے نظریات کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی گرویدہ رہی۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ و امریکہ تک پہنچی ، وہاں کے لوگوں نے اسپر پرشوق توجہ دی، اسکے چیلے بنے اور اسکے دئے ہوئے نئے نام کو اختیار کیا، گیروے رنگ کا لباس زیب تن کیا، مراقبے میں دلچسپی لی ، اسکے مذہبی خیالات ، خدا اور سیکس پر نظریات کو تسلیم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مغرب کو ایک ایسے ہی فرد کی تلاش تھی ۔ ایک روشن خیال شخص کی ایک قائم ذریعے کی جو افراد کو اپنے مذہب کا شعور دے سکے۔ جو نامکمل مذہبی شعور کو مکمل کر سکے ۔ رجنیش کی شکل میں انہیں ایک موقع ملا تھا کہ وہ محسوس کریں کہ روشن خیالی کسے کہتے ہیں اور روشن خیال کیسے ہوئے ہیں اور یہ کہ کسی خاص مذہب پر عمل پیرا ہوئے بغیر مذہبی ہونے کا کیا فائدہ ہے۔

رجنیش سے قبل بہت سے دوسرے لوگوں بشمول Gurdjieff نے مختلف روحانیات کے درمیان وسیلہ بننے کی کوشش کی اور خواہش رکھنے والوں کو مختلف راستوں سے ایک جگہ لاکر محبت ، ملنساری سے کام کی ترغیب دی لیکن کامیاب نہ ہوسکے ۔ روحانیت اور اس کے سسٹم کو وسیلہ بنا کر ایک گروپ کی شکل دینا دشوار ثابت ہوا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسانی ذہن کے مطالعے نے رجنیش کو اس میدان کا پیش رو بنا دیا ہے جسے وہ ''تیری نفسیات یا بدھا نفسیات'' کا نام دیتا ہے۔ پہلی قسم کی نفسیات، یعنی ذہنی عارضے سے متعلق نفسیات کی داغ بیل فرائڈ وغیرہ نے ڈالی جبکہ Maslow ، Fromm اور Janov نے صحت مند دماغ پر بھرپور توجہ دی ۔ انکی سوچ یہ تھی کہ علاج میں مرض کی علامات کے علاوہ مریض کی کل شخصیت مع ماحول کو نظر میں رکھا جائے۔ اس طرح دوسری قسم کی نفسیات وجود میں آئی جسے انسان دوست نفسیات کہا جاتا ہے۔ تیسرے قسم کی نفسیات کے متعلق رجنیش کہتا ہے کہ یہ پہلے نہیں تھی ، کسی نے بھی بیدار ذہن پر سائنٹیفک مطالعے کی زحمت گوار نہیں کی سوائے Gurdjieff کے لیکن وہ اپنے کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ رجنیش کہتا ہے کہ میں تیسرے پہلو پر کام کی کوشش کر رہا ہوں۔

رجنیش نے سوسائٹی کو تبدیل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، ظاہر ہے کہ وہ ناکام رہا لیکن سوسائٹی

میں مسلسل ہلچل اور تنازعہ کا ذریعہ بنا رہا۔

السٹرٹیڈ ویکل آف انڈیا کے مدیر نے اس کے متعلق بڑی اچھی رائے زنی کی ہے کہ وہ ''ایک روایت شکن' آزاد خیال' بناوٹی تقدس اور پاکبازی کا اظہار کرنے والوں سے نفرت کرنے والا' مقدس اور زندگی کی اچھائیوں سے محبت کرنے والا شخص ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ فرد واحد نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کا مجموعہ ہے۔ یہ شخص کیا ہے' اس بات کی وضاحت کی کوشش بے معنی ہے۔

وہ مارکس اور سوشلسٹ لٹریچر کا قاری ہونے کے باوجود روحانیت کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا۔ اسکا کہنا تھا کہ شعور اور احساس میں انقلابی تبدیلی ہی انسان کو امن اور خوشیوں سے ہمکنار کرسکتی ہے۔

لندن ٹائم کے Bernard Levin نے اس کے پونا آشرم میں کچھ وقت گزارنے کے بعد لکھا۔'' لیکن اگر وہ بھگوان ہے تو ایسا کہ اسے دیوتاؤں کی طرح نہیں پوجا جاتا۔ اسکی تقاریر میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ اس کے اپنے الفاظ میں۔'' کون کہتا ہے کہ میں دیوتا ہوں؟ صحافی نے رجنیش آشرم میں قیام پذیر ایک چیلے سے پوچھا کہ تم رجنیش کو کیا گردانتے ہو؟ تو اسنے دولفظوں میں پراثر جواب دیا کہ۔ ایک یاددہانی کرانے والا یا A Reminder۔''

رجنیش بنیادی طور پر ایک ایسے معاشرے کے قیام کی جدوجہد کررہا تھا جو مذہبی منافرت خاندانوں' قبیلوں اور روحانی اعتقادات سے پاک ہو۔ اپنے نظرئے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے اولڈ پونا اور اسکے بعد دیگر علاقوں میں'' کمیون'' قائم کئے جہاں مختلف نظریات اور رنگ ونسل کے لوگ ایک ساتھ رہائش پذیر تھے۔ وہ لوگ دست کاری کی صنعت کو پروان چڑھاتے اور مراقبے کے ذریعے دنیا کے آشوب سے خود کو محفوظ رکھکر خوشیوں کے حصول کے لئے جدوجہد کیا کرتے۔ پوری دینا میں پانچ سو سے زیادہ مراقبہ سینٹرز قائم ہوئے۔

رجنیش کے ارادتمندوں میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دینا کے دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے ہزارہا افراد، جن میں ہر طبقہ زندگی سے متعلق لوگ مثلا ڈاکٹرز، انجینئرز، تاجر، پروفیسرز، شاہی خاندان کے لوگ، اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد وغیرہ شامل تھے۔

رجنیش فاؤنڈیشن نے امریکہ میں Antelope کے قریب 64,000 ایکٹرز مین خریدی تاکہ ایک نئے کمیون کی داغ بیل ڈالی جاسکے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کمیون میں سنیاسی ایک ساتھ، ایک جسم اور ایک شخص کی طرح رہیں گے۔ کوئی چیز کسی کی نہیں ہوگی لیکن ہر شخص استعمال کرسکے گا ۔کوئی چیز کسی کی ملکیت نہیں ہوگی۔

وہ جنسی آزادی کا حامی تھا اور اس کا یہی نظریہ ہندوستان میں سخت ترین تنقید کا نشانہ بنا۔ وہ شادی کے خلاف اور کہا کرتا تھا کہ اگر تم کسی خاتون سے محبت کرتے ہو تو اس کے ساتھ رہو۔ بے

پناہ محبت کے ساتھ لیکن اس کے شوہر نہ بنو۔ کمیون میں اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی کی بیوی نہ بنو۔ بیوی یا شوہر بنا کر یہہ صورت ہے کیونکہ اس سے ملکیت وجود میں آتی ہے۔ وہ سیکس کو نہ صرف متبرک گردانتا ہے بلکہ اسے ایک عظیم اور پراسرار قوت سمجھتا ہے جو نئی زندگی کو تخلیق کرنے کا ذریعہ ہے۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس دنیا کا خالق خدا کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے کیونکہ، خالق اور تخلیقی صلاحیت سب کچھ ایک چیز ہے۔ جیسے رقص اور رقاصہ کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا ویسے ہی خالق اور مخلوق بھی ایک ہی ہے۔

رجنیش 11 دسمبر 1931 کو جبلپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اسکا تعلق جین مت سے تھا ۔اس کی شخصیت بچپن سے ہی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی تھی۔ اسکول کے زمانے میں وہ ہر بات کو تسلیم کرنے سے قبل بحث مباحثہ کیا کرتا تھا۔ بہر حال اس نے فلسفے میں MA کی سند حاصل کی اور اس کے بعد پروفیسر بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی روشن خیالی اور بصیرت نے دنیا کو ایک نئے انداز سے دیکھنا شروع کردیا۔ اس نے ہندوستان کے چپے چپے کا سفر کیا لیکچر دئے اور تقریریں کیں ،اس طرح لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اس کے نظریات انتہائی باغیانہ اور طرز کہن کے خلاف تھے۔ اسکا مطالعہ انتہائی وسیع اور ٹھوس تھا۔ وہ قومی اور نسلی بالادستی کے روایتی تصورات کا مخالف تھا اور مارکس کے سوشلزم کو رد کرتا تھا۔ Freud اور Jung کا ناقد تھا۔ ویٹیکن کے پوپ اور شنکراچاریہ (ہندودھرم کے بڑے) کو مذاق گردانتا تھا۔ اس کے علاوہ سیاستدانوں سے متعلق اپنے خیالات کو چھپاتا بھی نہیں تھا۔ ہندو اسکے لذتیاتی نظرئے کو ناپسند کرتے تھے۔ کمیونسٹ اسے روحانیت کا اسیر کہا کرتے تھے۔ صحافی اسے جنسی گرو سمجھتے تھے لیکن خود رجنیش اپنے متعلق کہتا ہے کہ'' میں مادہ پرست اور روحانیت کو ماننے والا اور حسیات پر مبنی مذہب کی تعلیم دیتا ہوں۔ میرے شاگردوں میں زوربا اور بدھا دونوں کی خصوصیات کو اطمینان بخش ہونا چاہئے''۔

گرو رجنیش نے جہاں ہزارہا تقریریں کیں وہیں بہت ساری کتابیں بھی تصنیف کیں جنکی تعداد سوا دوسو (225) کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ انہی کتابوں میں سے ایک Seeds of Wisdom کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ کتاب 119 حکایات پر مشتمل ہے۔ ہر حکایت میں عقل و دانش کے لئے کافی مواد موجود ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور وسیع مطالعہ رکھنے والا شخص تھا۔ یہ کتاب اس بات کی صداقت کا ایک ٹھوس ثبوت ہے۔ اسکا استدلال اور منطقی انداز بیان یہ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکی تمام باتوں، سارے نظریات سے ہر شخص متفق نہیں ہوسکتا لیکن استدلال اور منطق جس کے سہارے وہ اپنی بات کو پیش کرتا ہے وہ قاری کو گنگ ضرور کردیتی ہے۔ وہ یقیناً ایک فلسفی تھا اور بات کرنے کا

ڈھنگ جانتا تھا۔ بہر حال مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اسکی باتیں عقل و دانش کو غور و فکر کا سامان ضرور مہیا کرتی ہیں۔

اسکا کہنا ہے کہ ''ہم جسے موت سمجھتے ہیں وہ موت نہیں ہوتی۔ موت نہ تو دشمن ہے اور نہ ہی دوست بلکہ اسکا کوئی وجود نہیں۔ کسی کو اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہی نہ ڈرانے کی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے آگاہی حاصل کی جائے کیونکہ عدم آگاہی سے خوف میں مبتلا ہوا جاتا ہے لیکن اگر تم اس سے واقف ہو کہ موت ہے کیا تو کوئی خوف نہیں ہوگا۔''

وہ عبادت گاہ کے متعلق کہتا ہے۔ ''عبادت گاہ میں مذہب ہے کہاں؟ لوگ خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے بنائے بتوں کو پوج کر اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں۔ اپنے پیدا کردہ صحیفوں کو صداقت جانتے ہوئے طمانیت حاصل کرتے ہیں جس چیز کو انسان نے اپنے ہاتھوں اور ذہن سے بنایا ہو وہ مذہب نہیں ہوسکتا۔''

وہ یہ بھی کہتا ہے۔ ''میں بھگوان سے نہیں ڈرتا۔ خوف کسی کو خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔ خوف کی عدم موجودگی تمہیں وہاں تک پہنچا سکتی ہے۔'' ایک جگہ اس نے کہا۔ ''اپنی ذات کو نہ پہنچان کر ہم نے خود کو وا ہمے اور فریب پر مبنی شخصیت بنا لیا ہے اور ''میں'' خود پسندی کی شکل اختیار کر گیا ہے۔''

''خدا ہر ایک شخص کے چاروں جانب ہے۔ لیکن ہم چونکہ بے شعور ہیں اس لئے اسے نہیں دیکھتے۔

''میرے خیالات سے متاثر ہو کر ایک جوان شخص نے اپنی عبادت کی جگہ توڑ ڈالی اور یہاں آنے سے پہلے تمام بتوں کو پھینک دیا۔ میں نے اس سے کہا بتوں کو پھینکنے کے بجائے اپنے دماغ، اپنے ذہن کو پھینکو جو بت پیدا کرتا ہے اور عبادت کے مقام کو تباہ کرنے سے کیا حاصل ہوگا کہ دماغ تو عبادت کی ایک نئی جگہ پیدا اور نئے بت تعمیر کر لے گا۔''

''موت میں بقائے دائمی پوشیدہ ہوتی ہے اور موت ہی دراصل زندگی ہے۔''

رجنیش کیا، کسی شخص کی تمام باتوں سے ہر ایک شخص متاثر ہو کر اسے صحیح نہیں سمجھ سکتا چنانچہ بہت سارے لوگوں نے اسکے نظرتات کو برحق جانتے ہوئے اسے اپنا گرو بنایا اور اس سے بہت بڑی تعداد نے شدید مخالفت کی۔ بہر حال اس نے اپنے نظریات کو پر اثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش ضروری کی ہے۔

اب آپ کتاب کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ قدرت نے دُنیا میں کیسے کیسے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے مدیر کی طرح میں بھی اس بات سے متفق ہوں کہ ''یہ شخص کیا ہے، اس بات کی وضاحت کرنا بے معنی ہے۔''

مترجم

1

میں بھی ایک کاشتکار ہوں اور کچھ بیج بوئے ہیں۔ وہ بیج بار آور ہوئے اور اسمیں سے کونپلیں جلوہ ریز ہوئیں۔ اب گل و بوٹے اپنی دلکشی بکھیرنے کو ہیں۔ میری پوری زندگی ان پھولوں کی خوشبوؤں سے بھری ہوئی ہے اور اسی روح پرور مہک کے باعث میں خود کو ایک دوسری دنیا میں پاتا ہوں۔ اسی خوشبو نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی ہے اور اب مجھے عام نگاہوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

اندیکھی اور انجانی شے نے اپنے بند دروازے کھول دئے ہیں اور میں اب ایک ایسی دنیا دیکھ رہا ہوں جسے آنکھوں کے ذریعے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اور میں انہی کانوں سے موسیقی کی آواز سن رہا ہوں جو لذت سماعت سے محروم تھے۔ مجھے جو کچھ حاصل ہوا اور میں نے جو کچھ جانا وہ ویسا ہی ہے جیسے پہاڑوں سے گرتا ہوا آبشار، جسکے دھارے سمندر کی جانب بڑھتے جارہے ہیں۔

یا دیکھئے جب بادلوں میں پانی بھرا ہو تو وہ برستے ہیں۔ اور جب پھولوں میں خوشبو ہوتی ہے تو وہ ہواؤں کو عطر بیز کر دیتے ہیں اور جب لیمپ کو روشن کیا جائے تو اس سے بہر حال روشنی نکلا کرتی ہے۔

کچھ ایسا ہی واقعہ ظہور پزیر ہوا ہے، ہوائیں مجھ سے چند بیج لے اڑیں، انقلابی تخم۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ بیج اڑتے ہوئے کس زمین تک پہنچیں گے اور انکی آبیاری کون کریگا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اسی طرح بیج سے زندگی کے پھول کھلتے ہیں۔ بقائے دائمی کے پھول، مقدس پھول۔ وہ بیج جس زمین پر بھی گرتے ہیں تو وہ زمین بقائے دائمی کے پھولوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

موت میں بقائے دائمی پوشیدہ ہوتی ہے اور موت ہی دراصل زندگی ہے۔ بالکل اسی

طرح جیسے پھول زمین میں چھپے ہوتے ہیں لیکن بیج کی عدم موجودگی کے باعث زمین اپنی صلاحیت نہیں دکھا سکتی۔ یہی بیج اس پوشیدہ شے کو ظاہر کرتے ہیں جو چھپی ہوتی ہے۔

میرے پاس جو کچھ ہے، میں جو کچھ ہوں، میری خواہش ہے کہ میں اس بیج کو مقدس آگہی کے حوالے کردوں۔ میں نے جو تجربات حاصل کئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ محبت اپنی شدت میں اسے دور کردیتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اگر کوئی شخص خدا کو پہنچانتا ہے تو عشق میں گویا وہ خدا بن جاتا ہے۔ تجرباتی علم روحانی ضابطہ ہے اور عشق اسکی تکمیل۔

میں ایک گاؤں میں قیام پذیر رہا ہوں۔ وہاں میں نے کسی کو کہتے سنا کہ ”مذہب پرہیز گاری اور نفس کشی ہوتی ہے اور پرہیز گاری ایک سخت مشکل عمل ہوتا ہے۔“

میں نے جب یہ بات سنی تو مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں دریا کے کنارے پکنک منانے والوں میں شامل تھا۔ دریا تو چھوٹا تھا لیکن اسمیں بہت ساری ریت تھی۔ ساحل کی ریت پر بہت سارے لوگ رنگارنگ لباس میں لیٹے ہوئے تھے۔ مجھ کو لگا کہ میں جیسے کسی خزانے پر لغزیدہ قدموں سے چل رہا ہوں۔ شام کو میں نے چند عقیق کے ٹکڑے جمع کئے کیونکہ سب کو گھر لانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے جب انہیں ساحل پر ہی چھوڑ کر گھر آنے کا قصد کیا تو میری آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ لیکن مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب میں نے یہ دیکھا کہ میرے دوسرے ساتھیوں کو ان دلکش پتھروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس دن مجھے لگا تھا جیسے وہ لوگ تارک الدنیا یا رہبانیت اختیار کئے ہوئے لوگ ہیں لیکن آج میں سوچتا ہوں کہ اسمیں رہبانیت والی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ تم تو پتھر کو صرف پتھر سمجھ رہے تھے۔

لا علمی عیش کوشی ہوتی ہے

علم پرہیز گاری اور لاتعلقی

پرہیز گاری کسی عمل کا نام نہیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے کیا جائے۔ یہ تو بس وقوع پذیر ہوتی ہے۔ علم کا یہ قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ جبکہ عیش کوشی مشینی انداز میں خود بخود ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی چیز نہیں جسے کیا جائے۔ یہ لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ خیال کہ پرہیز گاری مشکل اور وقت طلب ہوتی ہے، ایک لایعنی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ کوئی عمل نہیں۔ تنہا تحرک مشکل اور وقت طلب ہوسکتا ہے۔ یہ ظاہری

انجام ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ پرہیز گاری میں جو چیز بظاہر چھوڑ دیتے ہیں وہ بے کار اور بے وقعت ہوتی ہے۔ لیکن جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ انمول شے ہوتی ہے۔

جو سچ پوچھئے تو پرہیز گاری کا وجود ہی نہیں ہوتا کیونکہ ہم چھوڑنے والی چیز سے بہت زیادہ حاصل کر لیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہم صرف اپنا ذہنی تسلط چھوڑتے ہیں لیکن اسکے عوض آزادی حاصل کرتے ہیں۔ ہم فضول سی چیز کو چھوڑ کر ہیرا پا لیتے ہیں۔ ہم موت کے بدلے ابدی زندگی پا لیتے ہیں۔ اندھیرا چھوڑ کے روشنی میں آجاتے ہیں۔ ابدی، کبھی نہ ختم ہونے والی روشنی۔ اس میں پرہیز گاری کہاں ہے؟ چھوڑیں یا گنوائیں کچھ نہیں لیکن حاصل سب کچھ کرلیں، اسے پرہیز گاری نہیں کہا جاسکتا۔

2

گزشتہ شب ایک شخص نے اپنی آخری سانس مکمل کی تھی ۔آج لوگ اسکے دروازے پر کھڑے افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس موقعے پر مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ مرگھٹ پر جانے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ چتا میں آگ لگائی گئی ۔لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آہستہ آہستہ گپ شپ کر رہے تھے۔گاؤں کے شاعر نے کہا۔ ''مجھے موت سے کوئی خوف نہیں آتا۔موت تو دوست ہوتی ہے۔''

اس کے بعد میں نے اسی قسم کی باتیں دوسرے لوگوں سے دوسرے مواقع پر بھی سنیں۔ میں انکی آنکھوں میں دیکھتا تو اس بے خوفی کی باتوں کے پیچھے خوف چھپا دکھائی دیتا۔

موت کو خوبصورت نام دینے سے حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی ۔ جو سچ پوچھئے تو موت کا ڈر نہیں ہوا کرتا، ڈر تو اس انجانی صورت حال کا ہوتا ہے۔انجانی صورت حال یا کیفیت ہم میں کیونکر خوف پیدا کرتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم موت سے آگاہی رکھتے ہوں۔ یہی آگاہی ہمیں خوف سے بچاتی ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اس آگاہی کے ذریعے ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم جسے موت سمجھتے ہیں وہ موت نہیں ہوتی۔

یہ صرف ہماری شخصیت ہوتی ہے جسے ہم اپنی سمجھتے ہیں۔یعنی ''میں'' بکھر کر یا تتر بتر ہو کر مر جاتا ہے۔ یہ اس لئے بکھرتا ہے کیونکہ وہ ہوتا ہی نہیں ۔ یہ تو صرف اجزاء کی یکجائی اور چند عناصر کا اتصال ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ عناصر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو شخصیت بکھر جایا کرتی ہے۔بس اسی کیفیت کو موت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی شخصیت اپنی حقیقی صورت میں اٹھائی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

شخصیت کا بغور جائزہ لو، جیسے ہی تم اپنی حقیقت تک پہنچو گے، تمہیں دوام حاصل ہو جائے گا یا یوں سمجھو کہ امر ہو جاؤ گے۔

اس سفر کا راستہ یعنی شخصیت سے ذات تک پہنچنا مذہب ہے۔

یہ مراقبے میں، روشن خیالی میں، موت سے شناسائی اور آگہی ہوتی ہے۔ ویسے ہی

جیسے سورج کی کرنوں کے ساتھ اندھیرا اپنی صفات کھو دیتا ہے۔

نہیں ۔ کسی کو اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ڈرنے کی ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے آگاہی حاصل کی جائے کیونکہ عدم آگاہی سے خوف میں مبتلا ہوا جاتا ہے۔ لیکن اگر تم اس سے واقف ہو کہ موت ہے کیا تو کوئی خوف نہیں ہوگا۔

3

ایک بار میں مندر گیا۔ عبادت گزاروں کا اژدہام دیوتا کی پوجاپاٹ میں مصروف تھا۔ عبادت کرنے والے بتوں کے سامنے سرنگوں تھے۔ ایک عمر رسیدہ شخص جو میرے ساتھ آیا تھا کہا۔ ''آج کل لوگوں کو مذہب پر یقین نہیں ہے۔ اس لئے بہت تھوڑے سے لوگ عبادت گاہوں میں آتے ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''عبادت گاہ میں مذہب ہے کہاں؟ لوگ خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو پوج کر اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے پیدا کردہ صحیفوں کو صداقت جانتے ہوئے طمانیت حاصل کرتے ہیں۔''

جس چیز کو انسان نے اپنے ہاتھوں اور ذہن سے بنایا ہو وہ مذہب نہیں ہوسکتا۔ مندر میں جتنے بت رکھے ہوئے ہیں وہ دیوتاؤں کی شبیہہ نہیں بلکہ خود انسان کی ہے۔ اور صحیفوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ انسان کی سوچ اور خواہش کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسمیں سچائی کہیں نظر نہیں آتی۔ سچائی یا صداقت کو لفظوں میں بیان کرنا انتہائی دشوار ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک بت سچا ہو کیونکہ سچائی غیر محدود ہوتی ہے۔ جب اسے کوئی شکل دی جائے تو وہ چھپ جایا کرتی ہے۔

اسے حاصل کرنے کے لئے تمام بتوں اور تجسیمی تصورات کو چھوڑنا پڑیگا۔ خود بنے ہوئے تمام جالوں کی صفائی کرنی ہوگی۔ اصل سچائی اس وقت نظر آئے گی جب انسان ذہن کی قید سے آزاد ہو جائے جسمیں اسنے خود کو اسیر کر رکھا ہے۔

جو سچ پوچھو تو سچائی تک پہنچنے کے لئے مندر تعمیر کرنے کی بجائے ہمیں انہیں مسمار کر دینا چاہیے اور بتوں کو تراشنا ترک کر دینا چاہیے بلکہ موجودہ بتوں کو توڑ دینا چاہئے۔ ہمیں غلط تصورات سے باہر نکل جانا چاہئے تاکہ ذہن میں اتنی گنجائش پیدا ہوسکے کہ وہاں حقیقی سچائی آسکے۔ ہمارے ذہن سے غلط تصورات جیسے ہی نکلیں گے، صحیح تصورات اور سچائی در آئیگی۔

سچائی اور صداقت تو وہاں پہلے بھی موجود ہوتی ہے لیکن وہ بتوں اور خود ساختہ چیزوں میں چھپ جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کسی بھرے پرے کمرے میں ہمیں خالی جگہ نظر نہیں آتی۔ ان فضول چیزوں کو ہٹا دو تو جگہ پیدا ہو جائے گی جو کہ وہاں ہمیشہ سے موجود ہے۔

صداقت اور سچائی بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ ذہن کو خالی کر دو، وہ وہاں موجود ہوگی۔

4

آج صبح میں نے ایک وعظ سنا۔ ایسا غیر ارادی طور پر ہوا ایک نام نہاد و عالم تقریر کر رہا تھا اور میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے۔ ''مذہبی راستہ، خوف خدا ہے۔ صرف وہی مذہبی شخص ہوگا جس کو خدا کا ڈر ہوگا۔ یہ خوف ہی ہوتا ہے جو خدا سے محبت پر آمادہ کرتا ہے۔ خوف کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر خوف نہ ہو تو محبت ناممکن۔''

عام طور پر جنہیں مذہبی کہا جاتا ہے وہ مذہبی اسی لئے ہوتے ہیں کہ انہیں ڈر ہوتا ہے۔ جنہیں بااخلاق کہا جاتا ہے وہ عام طور پر خوف یا ڈر کے اسیر ہوتے ہیں۔

کانٹ (Kant) نے کہا ہے۔ ''اگر خدا نہ بھی ہو، تو بھی یہ ضروری ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔'' شاید اس لئے کہ خوف خدلوگوں کو اچھا بنا دیتا ہے۔

میں جب اس قسم کی باتیں سنتا ہوں تو اپنی ہنسی کو نہیں روک پاتا۔ شاید اس لئے کہ اس سے زیادہ غلط اور غیر حقیقی بات کوئی دوسری نہیں ہوسکتی۔

مذہب کا خوف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب تو بے خوفی سے ہی وجود میں آتا ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ محبت، خوف کی مرہون منت ہو۔ خوف محبت کو کیونکر پیدا کرسکتا ہے؟ خوف سے اگر کوئی چیز پیدا ہوسکتی ہے تو وہ خودفریبی ہوسکتی ہے۔ جھوٹی محبت کے پیچھے اور کیا ہوسکتا ہے؟ ڈر اور خوف کے وجود سے محبت کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ مذہبیت اور اخلاقیات کا ڈر اور خوف سے متعلق ہونا یکسر غلط حقیقی ہے۔ یہ تو روح کی قوت کو بڑھانے کی بجائے پست کر دے گا۔ مذہب اور محبت کسی پر تھوپی نہیں جاسکتی۔ وہ تو خود ہی روشن اور منور ہوتی ہے۔

سچائی خوف یا ڈر میں نہیں پائی جاتی۔ خوف کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہے۔ سچائی کی بنیاد بے خوفی پر ہوتی ہے۔

مذہب کا حقیقی پھول اور محبت صرف بے خوفی کی زمین میں اگتے ہیں۔ خوف کی زمین پر مصنوعی پودا ہی لگایا جاسکتا ہے۔

خدا کو صرف بے خوفی کی حالت میں ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس بات کو مزید بہتر انداز میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ بے خوف شعور کو تسلیم کرنا، خدا کو تسلیم کرنا ہے۔ وہ لمحہ جب ذہن سے تمام خوف ختم ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ سچائی سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔

5

دوپہر کی گرمی اپنے عروج پر ہے۔ پلاسا (palasa) کے پیڑوں پر پھول انگاروں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

میں ایک خالی ویران راستے پر چلا جارہا ہوں ۔ راستے کے ساتھ ساتھ بانس کے درخت پرلطف انداز میں سایہ فگن ہیں۔

ایک مانوس پرندے نے موسیقی بکھیری، میں اسکی دعوت قبول کرتے ہوئے وہیں رک گیا۔

میرے ساتھ ایک شخص تھا اسنے پوچھا۔"غصے پر کس طرح قابو پاتے ہیں؟ اور سیکس پر کیونکر فتح پاتے ہیں؟"

آج کل یہ سوال باربار پوچھا جاتا ہے۔ سوال بجائے خود غلط ہے، چنانچہ میں نے اس سے اظہار کردیا۔

مسئلہ اسے فتح کرنے یا اس پر قابو پانے کا نہیں، اُسے جاننے کا ہے۔ ہم غصے کو سمجھتے ہیں اور نہ سیکس کو۔ یہی ناواقفیت ہماری شکست یا ناکامی کا موجب بنتی ہے۔

اور اس سے واقفیت فتح مند کرتی ہے۔ جب غصہ ہو یا سیکس کا غلبہ تو ہم انجان ہوتے ہیں۔ ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی چنانچہ ہم جانتے ہی نہیں۔ اس تکمل مشینی اور غیر شعوری کیفیت میں کیا ہوتا ہے۔ جب لاشعور کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے تو احساس ندامت سر اٹھاتا ہے جو بیکار محض ہوتا ہے۔ لیکن ندامت کا شکار شخص لمبی تان کر سوجاتا ہے تاوقت کہ سیکس اسپر دوبارہ غلبہ نہ حاصل کرلے۔

اگر وہ نیند کی چادر نہ اوڑھے، اگر اسکا شعور توانا اور بیدار ہو تو صحیح سوچ جلوہ گر ہوتی ہے۔ پھر وہاں نہ تو غصہ ہوتا ہے اور نہ سیکس۔ مشینی عمل رک جاتا ہے پھر نہ فتح مندی رہ جاتی ہے اور نہ کوئی دشمن۔

اس بات کو تم ایک علامتی کہانی کے ذریعے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو۔ اندھیرے میں ایک رسی سانپ جیسی دکھائی دیتی ہے۔ اسے دیکھ کر لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ہلاک کردینا چاہتے ہیں۔ لیکن دونوں ہی غلط تھے کیونکہ دونوں نے ہی رسی کے ٹکڑے کو سانپ سمجھ لیا تھا۔ پھر ایک شخص اس کے قریب جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ سانپ

نہیں بلکہ رسی کا ایک ٹکڑا ہے۔ چنانچہ اب اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی لہذا وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس شخص کو بس وہاں تک پہنچنا تھا۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ اور نہیں بلکہ ایک رسی کا ٹکڑا ہے۔ اسے کسی چیز سے نبردآزما ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ اسے بغیر کسی جنگ کے فتح مندی نصیب ہوگئی۔

گویا اپنے ذہن کو صحیح طور پر دیکھنا ہی زندگی کی فتحمندی کی چابی ہے۔

6

رات گزرگئی اور آفتاب کی کرنوں نے زمین پر پھیلنا شروع کردیا۔ ہمنے ابھی ابھی ایک چھوٹے سے دریا کو پار کیا ہے۔ٹرین کی آواز سن کر بگلوں کا ایک جھنڈ سورج کی طرف اڑنے لگا۔

پھر کوئی واقعہ ہوا اور ٹرین رک گئی۔ اس سناٹے میں ٹرین کے رکنے سے مجھے مسرت کا احساس ہوا۔ میرے انجانے ساتھی مسافر بھی جاگ رہے تھے۔ وہ لوگ رات میں کسی اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ وہ شاید مجھے سنیاسی سمجھ رہے تھے اس لئے میرے پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھے۔ انکی آنکھوں میں کوئی سوال تھا جو مجھ سے پوچھنا چاہتے تھے۔ بالآخران میں سے ایک شخص نے کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی زحمت نہ ہو تو میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میری دلچسپیاں خدا میں ہیں اور میں نے اس کی قربت کے لئے سخت جدوجہد کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایسا نہیں چاہتا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''گزشتہ دن میں ایک باغ میں گیا تھا۔ میرے ہمراہ کچھ دوست بھی تھے۔ انمیں سے ایک شخص پیاس محسوس کررہا تھا۔ اسنے کنویں میں ایک بالٹی ڈالی۔ کنواں بہت گہرا تھا چنانچہ بالٹی کو کھینچ کر اوپر تک لانے میں کافی دقت ہوئی۔ لیکن جب بالٹی اوپر آئی تو وہ خالی تھی۔ دوسرے سب لوگ ہنسنے لگے۔

''مجھے لگا کہ بالٹی انسانی ذہن جیسی ہے۔ اسمیں بہت سے سوارخ تھے اسکے علاوہ کہیں کہیں سے پھٹی ہوئی تھی۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ابتدا میں بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی لیکن اوپر تک آتے آتے سوراخوں سے پانی گرتا رہا اور وہ خالی ہوگئی۔ ہمارے دماغ میں بھی بہت سارے سوراخ ہیں۔ جس سے مسلسل اخراج جاری رہتا ہے اور بالآخر خالی ہوجاتا ہے۔ اگر تم میرے دوستو وقت پر بالٹی کی مرمت کرالیا کرو تو آسانی سے پانی بھرا جاسکتا ہے۔ بے شک، سوارخ والی بہتی ہوئی بالٹی کے باعث تمہیں زہد اختیار کرنے میں کافی مشق کرنی ہے اور تمہاری پیاس نہیں بجھ پاتی۔

یاد رکھو وجود یا زندگی نہ تو موافق ہوتی ہے اور نہ ناموافق۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنی بالٹی کو ہر طرح محفوظ رکھو۔ کنواں تو ہر وقت تمہیں پانی فراہم کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ وہ تمہیں پانی دینے سے کبھی منع نہیں کرتا۔

7

ایک دن میں دریا کے ساحل پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کاغذی کشتی پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

ایک دن قبل کچھ بچوں نے ریت کے محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ وہ بھی زمین بوس ہوچکے تھے۔

میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے خواب پورے نہیں ہوئے تھے۔ وہ زندگی سے بیزار ہوچکی تھی۔ اور خودکشی کرنے پر کمربستہ نظر آرہی تھی۔ اسکی آنکھیں اپنے حلقے میں دھنس چکی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''وہ کون ہے جسکے خواب پورے ہوئے ہوں؟ ہر خواب کا انجام دکھوں پر ہوتا ہے کیونکہ کاغذی کشتی تیرتی تو ہے لیکن تابہ کے۔؟ وہ کتنی دیر تیر سکتی ہے۔؟ خواب غلط نہیں ہوتے لیکن انکا حصول قدرتی طور پر ناممکن ہوتا ہے۔ غلطی ہماری ہوتی ہے۔ ہم سوتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں اور سوتے ہوئے ہم کوئی چیز حاصل نہیں کرسکتے۔ بیدار ہونے کے بعد ہم سوچتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ خواہش کی اسے حاصل کرلیا تھا جبکہ وہ حاصل نہیں ہوئی۔

''خواب میں موت جبکہ حقیقت اور سچائی میں زندگی ہے، خواب کا مطلب نیند اور حقیقت کا بیداری ہے۔ بیدار ہوکے خود اپنے آپ کو سمجھو۔ دماغ جب تک خواب دیکھتا رہیگا وہ خود کو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف بصیرت میں ہی سچائی ہے۔ جیسے ہی ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے ہم ڈوبی ہوئی کشتی پر ہنستے ہیں اور محلات کو گرادیتے ہیں۔''

8

صوفیوں کا ایک نغمہ ہے۔

ایک عاشق نے اپنی محبوبہ کے دروازے پر دستک دی۔ ایک آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' باہر موجود شخص نے جواب دیا۔ ''یہ میں ہوں'' اسنے جواب سنا۔ ''اس گھر میں دو آدمیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے یعنی میں اور تم کے لئے۔

بند دروازہ بند ہی رہا۔ عاشق ایک جنگل میں چلا گیا۔ اور وہاں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ برت (روزہ) رکھنے لگا، عبادت کرنے لگا۔ کئی برس بعد وہ واپس ہوا اسی دروازے پر دوبارہ دستک دی۔ آواز نے پھر پوچھا۔ ''کون ہے؟'' جواب سنتے ہی دروازہ کھل گیا کیونکہ جواب میں کہا گیا تھا کہ ''یہ تم (thou) ہو''۔

یہ جواب کہ ''یہ تم ہو'' تمام مذہب کا جوہر ہے۔ زندگی کا بہتا ہوا دریا جبکہ ''میں'' صرف ایک بلبلہ۔ ''میں'' فردواحد کی حقیقت کا نعم البدل۔ ''میں'' کا بلبلہ خود کو دریا سے جدا رکھتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہستی سے الگ وہ کچھ بھی نہیں۔ اسکا الگ کوئی مرکز نہیں اور نہ ہی کوئی ہستی کوئی زندگی ہے۔ یہ سمندر ہے، سمندر ہی اسکی زندگی ہے۔ اسکی ہستی کا دارومدار سمندر پر ہی ہے۔ یہ خیال کہ سمندر سے الگ اسکی کوئی زندگی ہے، محض باطل سوچ ہے۔ بلبلے کو دیکھو، تمہیں سمندر نظر آئے گا، اور ''میں'' پر نگاہ ڈالو تو تمہیں برہمن دکھائی دیگا، جہاں ''میں'' کا کوئی وجود نہیں وہیں ''تم'' بھی غیر موجود ہے۔ وہاں تو صرف ہستی ہے۔ صرف زندگی۔ خالص ہستی۔ اس خالص زندگی میں بیداری نروان ہے یعنی روحانی سکون، ذاتی انا سے چھٹکارا۔

9

مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ روشنی کا واحد ذریعہ تھا۔ لیکن ہوا کے جھونکے نے اسے گل کر دیا۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور لیمپ کی لو یا شعلے کو بجھا دیا۔ ہم لیمپ پر کب تک بھروسہ کر سکتے ہیں؟ جب وہ اتنی جلدی بجھ جائے۔ آخر بڑی لو بھی کب تک روشن رہ سکتی ہے؟ ہم لوگ اندھیرے سمندر میں ڈوب گئے۔

میرے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تاریکی سے سخت خوفزدہ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اسکی ہستی بری طرح سے ہل چکی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ سانس بھی مشکل سے لے رہا تھا۔

میں اس سے کہتا ہوں۔ ''اندھیرے اور تاریکی نے اس دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اور دنیا کے پاس ندھیرا دور کرنے کے لئے روشنی نہیں ہے۔ روشنی کی جتنی بھی لو ہے وہ ختم ہوتی جارہی ہے وہ جھلملاتے تو ہیں لیکن اندھیرے پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دنیا کی تاریکی کو بقائے دوام حاصل ہے۔ اور وہ لوگ جو اسپر بھروسہ کئے ہوئے ہیں فراست سے محروم ہیں کیونکہ روشنی کی لو حقیقی نہیں ہے۔ نتیجتاً سب ہی لوگ اندھیرے کے زیر اثر ہیں۔

''لیکن ایک دوسری دنیا بھی ہے۔ ایک مختلف دنیا جو دکھائی نہیں دیتی، اگر یہ دنیا تاریک ہے تو دوسری روشن۔ اگر اس دنیا میں روشنی عارضی ہے اور تاریکی مستقل تو دوسری دنیا میں تاریکی عارضی اور روشنی مستقل۔

عجیب بات یہ ہے کہ تاریک دنیا ہم سے بہت دور ہے جبکہ روشن دنیا انتہائی قریب۔

''تاریکی باہر ہے اور روشنی ہمارے اندر۔

''اور یاد رکھو اگر تم نے اپنے اندر کی روشنی سے استفادہ نہیں کیا تو کوئی دوسری روشنی تمہارے خوف کو دور نہیں کر سکتی۔ اس فانی لیمپ پر بھروسہ کرنا چھوڑ دو، اس روشنی پر بھروسہ کرو جو ابدی ہے، ہمیشہ قائم رہنے والی۔ وہ اکیلی ہی تمہیں بے خوف بنا دیگی۔ روحانی سکون اور روشنی کو تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ بس یہی چیز ہماری اپنی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ہم گھاٹے میں نہیں ہوں گے۔ صرف وہی چیز ہماری ہے جسے ہم باہر سے نہیں حاصل کرتے۔

"بے شک تمہاری آنکھوں کے باہر تاریکی ہے لیکن جب تم اپنی آنکھوں میں دیکھتے ہو تو تمہیں کیا ملتا ہے؟"

"اگر وہاں تاریکی ہے تو تم اندھیرے کو کیسے پہچانتے ہو؟ وہ جو اندھیرے کو پہچانتا ہے وہ خود تاریک نہیں ہو سکتا۔

"اگر وہ روشنی کی شدید خواہش رکھتا ہے تو اس کے پاس تاریکی کیونکر ہو سکتی ہے؟ وہ تو خود روشنی کا آرزومند ہے۔ وہ روشنی ہے اسی لئے وہ روشنی کا طالب ہے۔ روشنی کو ہی روشنی کی پیاس ہوتی ہے۔ اس جگہ کو تلاش کرو جہاں سے تمہاری پیاس کا آغاز ہوا ہے۔ بس اسی جگہ کو اپنا مطمع نظر یا منزل بنالو۔ تم دیکھو گے جس کی تمہیں پیاس سے وہ شے وہیں موجود ہے۔

10

میں بھگوان سے نہیں ڈرتا، خوف کسی کو خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔ خوف کی عدم موجودگی ہی تمہیں وہاں تک پہنچا سکتی ہے۔

اس طرح میں اس پر یقین بھی نہیں رکھتا۔ یقین اندھا ہوتا ہے۔ پھر ایک اندھا شخص حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟

میں کسی مذہب کا پیروکار بھی نہیں کیونکہ مذہب کو تقسیم بھی نہیں کیا جا سکتا اور اسکی درجہ بندی بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف ایک اور ناقابل تقسیم ہے۔

میں نے کل جب یہ بات کہی تو مجھ سے ایک شخص نے پوچھا۔ "کیا تم دہریہ ہو؟"

میں نہ تو دہریہ ہوں اور نہ ہی خداپرست، یہ حد بندی محض فضول ہے، صرف دانشورانہ، اسکا وجود حیات سے کوئی تعلق نہیں، حیات کو "ہے" اور "نہیں ہے" میں نہیں بانٹا جاتا۔ یہ امتیاز یا فرق محض ذہنی ہے۔ اسی طرح دہریت اور خداپرستی بھی ذہنی ہے۔ یہ روحانیت تک نہیں لیجاتا۔ مثبت اور منفی روحانیت، دونوں ہی تجربات سے ماوراہیں۔

دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ایک ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی تقسیم نہیں۔ ذہنی ادراک کسی نظرئے کو نہیں قبول کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دہرئے، دہریت کو چھوڑ دیں اور خداپرست، خداپرستی کو۔ اس طرح وہ یقیناً سچائی کی دنیا میں پہنچ سکتے ہیں۔ دونوں ہی چیزیں تصوراتی سوچ پر مبنی ہیں۔ نظریات اور تصورات ایک طرح کی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ ہم سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ سچائی کے متعلق فیصلہ کرو۔

یادرکھو ہمیں سچائی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرنا ہوتا۔ ہمیں بس تسلیم کرنا ہوتا ہے۔ وہ جو ذہانت کے فیصلے، منطقی تصورات، ذہنی طور پر سوچ اور فہم کے نظرئے اور مفروضے ترک کر دیتے ہیں، ایسی صورت میں ذہنی معصومیت انہیں سچائی دکھاتی ہے۔

چنانچہ ہم ایسے شخص کو جو دہریہ ہو اور نہ خداپرست، ایک مذہبی شخص سمجھتے ہیں۔ مذہبیت بہت سے لوگوں کے اندر ایک خیال اور تصور ہوتا ہے جو چھلانگ لگا کر اندر پہنچ جاتا ہے۔

جہاں کوئی خیال اور تصور نہ ہو بلکہ ذہن خالی ہو، جہاں کوئی انتخاب نہ کرنا پڑے، یعنی انتخاب کی سہولت نہ ہو، جہاں کوئی لفظ نہ ہو، ہم وہاں سے مذہب میں داخل ہوتے ہیں۔

11

میں رات میں چہل قدمی کے لئے نکلا۔گاؤں کی سڑک قطعی ناہموار تھی ۔ میرے ساتھ ایک سادھودوست تھا۔اس نے بہت سفر کررکھا تھا۔شاید ہی کوئی ایسا مقدس مقام ہو جہاں کی اسنے زیارت نہ کی ہو۔اسنے راستے کو دیوتائی راہ گردانا۔

اس رات اسنے مجھ سے ایک سوال کیا۔''وہ کونسا راستہ ہے جسے ہم مقدس کہہ سکیں؟''

یہی سوال اس نے دوسرے بہت سے لوگوں سے بھی کیا تھا،اس طرح آہستہ آہستہ وہ بہت سے مقدس راستوں کو سمجھ چکا تھا۔لیکن اس میں اور نیابت الٰہی میں جو فاصلہ تھا وہ برقرار رہا۔ایسا نہیں ہے کہ اس نے ان مقدس راستوں پر چلنے کی کوشش نہ کی ہو۔وہ جو کچھ کرسکتا تھا کرلیا۔لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بس ان راستوں پر چلتا رہا۔منزل پر نہ پہنچ پایا۔لیکن اسنے ہمت نہیں ہاری اور نئے راستوں کو تلاش کرتا رہا۔

میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر کہا''میں جو کچھ بھی ہوں اس کے لئے کوئی راستہ نہیں۔راستے دوسرے تک پہنچنے کے لئے ہوتے ہیں یا فاصلہ طے کرنے کے لئے۔کیا قریب ہے۔نہ صرف قریب بلکہ میں جو کچھ بھی ہوں۔اسے راستے کے ذریعے حاصل نہیں کرسکتا۔راستے کے درمیان میں کوئی رابطے کی جگہ نہیں۔ہم وہ چیز پاتے ہیں جو گم ہوئی ہو۔لیکن الوہیت کیا گم ہوسکتی ہے۔''

دسترس سے وہی چیز نکلتی ہے جو اسکی اپنی نہ ہو۔ذات صرف بھلائی جاتی ہے۔

چنانچہ کسی کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ایک شخص کو صرف یاد رکھنا ہوتا ہے۔کچھ کرنا نہیں ہوتا۔صرف جاننا ہوتا ہے۔اور جاننا ہی پانا ہے۔ہمیں کیا جاننا چاہئے کہ''میں کون ہوں؟''یہی جاننا دیوتائیت پانا ہے۔

ایک دن جب ہماری تمام کوشش رائیگا ہوجائے جب کوئی راستہ لگے کہ کہیں نہیں لیجارہا ہے، تب یہ بات صاف ہوجائیگی کہ ہمیں سچائی نہیں حاصل ہوگی۔''میں'' کی پراسراریت سمجھنے کے لئے کوئی عمل نہیں، کیونکہ تمام عمل دور لیجاتا ہے۔

کوئی عمل ہمیں اپنی ہستی یا وجود تک نہیں لیجاتا۔عمل جہاں رکتا ہے وہیں ہستی ظاہر ہوتی ہے۔

کسی عمل سے ہم اسے نہیں پاسکتے کیونکہ وہ تو عمل سے پہلے بھی وجود رکھتا ہے۔

وہاں تک کوئی راستہ نہیں لیجاتا کیونکہ وہ تو وہیں موجود ہے۔

12

ایک شام،جھیل گلیلی پر شدید قسم کا طوفان تھا۔ایک کشتی قریب قریب ڈوبنے والی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ اس کو تباہی سے نہیں بچا جاسکتا۔مسافر اور کشتی کے ملاح سب ہی بے بس تھے۔تباہی نے سب کو گھیر رکھا تھا۔لہریں کشتی کے اندر تک پہنچ رہی تھیں اور ساحل کافی دور تھا۔اس شدید طوفان کے باوجود ایک شخص کشتی کے ایک کونے میں محوخواب تھا۔اسے کوئی غم کوئی فکر یا تشویش نہیں تھی۔اسکے ساتھیوں نے اسے نیند سے بیدار کردیا۔ان سب لوگوں کی آنکھوں میں موت کے سائے دکھائی دے رہے تھے۔

جاگنے کے بعد اس شخص نے پوچھا۔''تم سب لوگ اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟''خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ تو نظر نہیں آتی۔اس کے ساتھی گنگ سے ہوگئے۔انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔اسنے دوبارہ پوچھا۔''کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟''

یہ کہتے ہوئے وہ خاموشی اور اعتماد کے ساتھ اٹھا اور چلتے ہوئے کشتی کے کنارے پہنچا۔طوفان کی تندی اپنے عروج پر تھی اور کسی بھی لمحے کشتی کو الٹنے والی تھی۔متلاطم جھیل کو اس نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''پرسکون ہوجا''

اسنے کہا۔''پرسکون ہوجا۔''ایسا لگتا تھا جیسے طوفان کوئی شریر بچہ ہو۔مسافر حیرت زدہ تھے کہ کیسا پاگل پن ہے۔کیا طوفان اس درخواست اور ہدایت پر عمل کریگا؟ لیکن انہوں نے دیکھا کہ طوفان کم ہوکر ختم ہوگیا اور جھیل اس طرح پرسکون ہوگئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔اس شخص کی آواز سن لی گئی تھی۔

وہ حضرت عیسیٰؑ تھے اور یہ واقعہ دو ہزار برس پہلے رونما ہوا تھا۔لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس طرح کے واقعات روزانہ ہوا کرتے ہیں۔

کیا ہم لوگ مسلسل اور لگاتار طوفان کی زد پر نہیں رہا کرتے۔بے تاب و پریشان؟ کیا ہماری آنکھوں میں موت کا خوف ہر گھڑی نہیں رہا کرتا؟ کیا ہمارے اندر کی جھیل مسلسل مضطرب نہیں رہا کرتی؟ کیا ہماری زندگی کی کشتی، ایسا نہیں لگتا کہ ڈوبنے والی ہے؟

چنانچہ ہمارا یہ پوچھنا مناسب نہیں ہوتا کہ۔''تم خوف زدہ کیوں ہو؟ اور یہ'' تمہارا ایمان کیا نہیں ہے؟'' کیا ہم خود اپنے اندر جھانک کر اپنی مضطرب جھیل سے یہ نہیں کہہ سکتے

کہ ''خاموش اور پرسکون ہوجا؟''

میں نے اسکا تجربہ کیا ہے اور دیکھا ہے کہ طوفان تھم جاتا ہے۔ یہ بس سادہ سی بات ہے کہ ہم سکون کو محسوس کرنے کی ابتدا کریں اور بالآخر سکون آجاتا ہے۔ ہم خود کو بے آرام رکھتے ہیں۔ ہمیں خود کو پرسکون رکھنا چاہئے۔ سکون کا حصول مشق کے ذریعے نہیں ہوتا۔ یہ صحیح احساس سے ملتا ہے۔

سکون ہماری فطرت ہے۔ یہاں تک کہ شدید آزمائش میں بھی ایک نکتہ ایسا ہوتا ہے جہاں سکون موجود ہوتا ہے۔ ہمارے اندر ایک شخص موجود ہوتا ہے جو شدید طوفان میں خاموشی سے سورہا ہوتا ہے۔ بس اسی پرسکون، خاموش، ساکت اور بے فکر جگہ پر ہمارا حقیقی وجود موجود ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وجود کے ہوتے ہوئے بھی ہم بے چین ہوجاتے ہیں۔ وہاں تک واپس پہنچنا معجزاتی عمل نہیں ہوتا۔

اگر تمہاری خواہش پرسکون ہونے کی ہو، تم اسی وقت وہاں پہنچ سکتے ہو، عین اسی مقام پر۔ مشق کے نتائج مستقبل میں ملتے ہیں۔ جبکہ صحیح محسوسات کے نتائج فوراً برآمد ہوتے ہیں۔ صحیح محسوسات سے ہی حقیقی تبدیلی آتی ہے۔

13

میں کبھی کبھی خود سے سوال کرتا ہوں کہ ''میں کون ہوں؟'' اسکا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کتنی راتیں اور دن میں نے سوال کیا ہوگا۔ دوسرے لوگوں کی ذہانت کے جوابات سنائی دئے یا پیدا ہوئے کہ یہ جاننا ناممکن ہے۔ سب ہی لوگوں نے دوسروں کے بے جان خیالات کو دہرایا۔ اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ انتہائی سطحی طور پر دکھائی دیکر غائب ہوگئے۔ دل نے انہیں قبول کیا۔ گہرائی میں بازگشت نہیں سنائی دی۔ اس سوال کے بہت سے جوابات تھے لیکن کوئی درست نہیں تھا۔ وہ سوال کی سطح تک نہیں پہنچ سکے۔

پھر میں نے دیکھا کہ سوال قلب کے بیچ سے آیا تھا لیکن جوابات صرف سطح کو چھورہے تھے۔ سوال تو میرا تھا لیکن جوابات باہر سے آئے تھے۔ سوال میرے اندر کی گہرائی سے آیا تھا لیکن جوابات باہر سے ملے تھے۔ یہ بصیرت ایک انقلاب بن گئی۔ ایک نیا پہلو سامنے آیا۔

ذہین لوگوں کا ردعمل بے معنی تھا۔ اسکا مسئلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایک الجھاؤ ختم ہوگیا اور مجھے بے پناہ سکون مل گیا۔

ایسا لگا کہ جیسے ایک بند دروازہ چوپٹ کھل گیا ہو۔ اندھیرے میں روشنی در آئی۔ ذہین لوگ جو جوابات دے رہے تھے۔ غلطی یہی تھی۔ انہی غلط جوابات کی وجہ سے حقیقی جواب نہیں مل پارہا تھا۔ کچھ حقائق اور سچائیاں سطح پر مچل رہی تھیں۔ شعور کی گہرائیوں میں کچھ بیج پھوٹ کر باہر نکل رہے تھے تاکہ روشنی اندر آسکے۔ سوچنے کی قوت ایک رکاوٹ تھی۔

اس بات کے صاف ہوتے ہی، سوال تحلیل ہونا شروع ہوگیا۔ باہر سے حاصل شدہ معلومات ہوا میں اڑنا شروع ہوگئیں۔ سوال اور زیادہ گہرائی تک اتر گیا۔ میں نے مزید کچھ نہیں کیا بس بیٹھ کے دیکھتا رہا۔

کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا جسکے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہاں میرے کرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ بس میں ایک شاہد ہو کے رہ گیا تھا۔ سطحی ردعمل ختم ہونے لگا تھا۔ محویت بے وجود ہونے لگی قلب کے بیچ بازگشت اپنی آب وتاب سے پیدا ہونے لگی۔

''میں کون ہوں؟'' میرا پورا وجود سرخوشی کی پیاس سے مرتعش ہوگیا۔ یہ کیسا شدید طوفان تھا۔ ہر سانس اس میں جھوم رہی تھی۔

''میں کون ہوں؟'' یہ سوال ایک تیر کی طرح ہر چیز سے گزرتا ہوا مجھ میں حرکت کرنے لگا۔

مجھے یاد ہے کہ یہ کتنی شدید پیاس تھی۔ میرا پورا وجود پیاس میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ہر چیز ہل رہی تھی۔ یہ سوال آگ کے شعلے کی طرح مجھ میں موجود تھا۔ ''میں کون ہوں؟''

حیرت یہ تھی کہ ذہانت یا جاننے کی قوت یکسر خاموش تھی۔ خیالات کا سیلاب رک گیا۔ آخر کیا بات ہوئی؟ سطح کی حدود قطعی ساکت ہوگئی تھیں۔ اب کوئی خیال نہیں رہ گیا تھا۔ ماضی کی کیفیت نہیں رہ گئی تھی۔

وہاں صرف میں تھا۔ اور وہ سوال بھی۔ نہیں، نہیں میری ذات ہی ایک سوال تھی۔

اس کے بعد دھما کہ ہوا۔ دوسرے ہی لمحے سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ سوال بھی ختم ہوگیا۔ کسی دوسرے پہلو سے جواب آگیا۔

ایک دھماکے کے ذریعے یکا یک سچائی تک رسائی ہوگئی۔ یکا یک، رفتہ رفتہ نہیں۔

اس کے ظہور کے لئے کوئی دباؤ نہیں ہوسکتا تھا۔ بس وہ خود ہی آنے لگا۔

مشکل کا حل خالی پن ہے۔ الفاظ نہیں۔ لاجواب ہونا ہی جواب ہے۔

گزشتہ دن کسی نے پوچھا تھا۔ وہ اور دوسرے ہر دن پوچھتے ہیں کہ ''جواب ہے کیا؟''

میں کہتا ہوں۔ ''اگر میں نے یہ بتایا تو وہ بے معنی ہوگا۔ اس کے معنی تو خود اپنی شناخت میں پوشیدہ ہیں۔''

میں کوئی مبلغ نہیں ہوں۔ نہ میری خواہش وعظ کہنے کی ہے اور نہ سبق پڑھانے کی۔

میں اپنے اندر آنے والے خیالات کو تمہارے ذہن میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ سارے خیالات بے کار ہوتے ہیں۔ وہ گرد کے زرات کی طرح تم سے چمٹے رہتے ہیں۔ اور پھر تم خود کو وہ سمجھنے لگتے ہو جو حقیقتاً نہیں ہوتے۔ تم یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے یہ خودکشی ہوتی ہے۔

خیالات کے ذریعے نا آگاہی نہیں دور ہوتی۔ یہ صرف چھپ جاتی ہے۔ اگر آگاہی کو بیدار کرنا ہوتو ضروری ہے کہ اسے کھلے طور پر دیکھو۔ اسے خیالات کے لبادے میں نہ چھپاؤ۔ تمام لبادے اور پوشش کو ہٹا دو۔ یہ جہالت تک پہنچنے کا ذریعہ اور پل بنجائے گا۔ اگر تم اپنی نا آگہی تک پہنچنے کی اذیت اٹھالوگے تو یہی انقلاب کا ابتدائی مرکز ہوگا۔

چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ تم پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا دوں بجائے اس کے کہ چھپاؤں۔ دیکھو کتنے بہت سارے غلط اعتقادات، تصورات اور خوش گمانیوں میں تم چھپے ہوئے ہو۔ اور تم ان رکاوٹوں کے باوجود خود کو کتنا محفوظ و مامون سمجھتے ہو۔ یہ حفاظت نہیں فریب دہی ہے۔

میری خواہش ہے کہ میں تمہاری نیند میں خلل ڈالوں۔ صرف سچائی اور حقیقت ہی، خواب نہیں، تمہاری محافظ ہے۔

اگر تم اپنے خوابوں سے خود کو بچانے کی جرات رکھتے ہو تو تم حقیقت اور سچائی تک پہنچ سکتے ہو۔ سچائی تک پہنچنے کا کتنا اچھا سودا ہے کہ تم صرف اپنے خوابوں کے حصار سے نکل جاؤ اور بس۔

تمہیں بے شعوری کو ختم کرنا ہے۔ اسکے خیالات، خواب، اور خوش گمانیوں سے باہر نکلنا ہے۔

''بصیرت، صرف بصیرت ہی سچائی ہے۔ اگر تم اسے حاصل کر لیتے ہو تو تم زندگی پالوگے۔''

یہ بات میں نے کسی سے کہی تھی۔ وہ سننے کے بعد سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم تو خیالات کے دریا میں غوطہ زن ہوگئے۔ یہ ہی غفلت کی نیند ہے۔ میں نے زور دیکر کہا کہ بیدار ہو جاؤ۔''

ایک بیل گاڑی گزر رہی ہے۔ میں اس کے پہیوں کو گھومتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ پہیہ ساکت محور پر گول گھوم رہا ہے۔ بے حرکت محور حرکت کرتے ہوئے پہئے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ حرکت کے پیچھے سکوت ہے۔ وجود کے پیچھے لاوجود موجود ہے۔

اسی طرح ایک دن میں نے گردوغبار کا طوفان دیکھا۔ گرد کا ایک بڑا مرغولا آسمان کی جانب بڑھ رہا ہے جبکہ اسکا مرکز خاموش اور بے حرکت تھا۔ کیا یہ علامات زندگی کی سچائی کو واضح نہیں کرتیں؟ کیا وجود کے پیچھے لاوجود نہیں موجود؟ کیا تمام حرکتوں (Action) کی پشت پر بے حرکتی نہیں؟ وجود کا مرکز صرف لا وجود اور روح ہے۔ اسے تن تنہا تسلیم کرنا ہے۔ وہاں صرف ہمیں ہونا چاہئے کیونکہ ہماری زندگی کی حقیقت پہلے ہی وہاں موجود ہے۔ ہم جہاں ہیں، اسکے علاوہ کسی دوسری جگہ نہیں جائیں گے۔

اس کی تکمیل کس طرح کرنی ہے؟

جو دکھائی دے رہا ہے اسے دیکھو، اس طرح تم لاوجود میں پہنچ جاؤ گے۔

ہمیں منظر سے ابتدا کرتے ہوئے شاہد کی جانب بڑھنا ہے۔ دیکھنا طریقہ عمل اور وجود ہے۔ شاہد کی کوئی صورت نہیں اور نہ ہی کوئی عمل ہے اور نہ لاوجود۔ منظر کوئی اور چیز ہے یعنی عارضی، چند روزہ دنیا۔ محکومی وغیرہ اور دوبارہ پیدا ہونے کا دائرہ۔ اسے دیکھو جو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ یہی تپسّیا اور مراقبے کی روح ہے۔

یہ وہی ہے جسکا میں روزانہ تجربہ کرتا ہوں یا پھر یوں سمجھو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بس یہی کچھ ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کی پیاس ہے۔ یہ کیسی پیاس ہے۔ اسے میں ہر ایک شخص میں دیکھتا ہوں۔ کوئی چیز مضطرب ہے اور پرسکون ہونا چاہتی ہے۔ انسان اسکی کن کن طریقوں سے تلاش کرتا ہے۔ شاید یہ تلاش پوری زندگی جاری رہے۔ کسی سنہرے ہرن کی تلاش میں، انسانی ذہن ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔

لیکن ہر قدم اسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ وہاں تک پہنچے کا کوئی طریقہ کوئی راستہ نہیں دکھائی دیتا۔ کوشش اور کاوش کے باوجود منزل دکھائی نہیں دیتی۔

گویا کوئی راستہ نہیں؟

اس سوال کے جواب کی ضرورت نہیں۔ زندگی خود اسکا جواب ہے۔ کیا ہر طرف اور ہر راستے کو دیکھنے کے بعد بھی سوال کا جواب نہیں ملا؟

کیا ابھی تک جواب نہیں موصول ہوا؟

ایک ذہانت پر مبنی جواب کے مطابق، حقیقی جواب دھویں میں اڑ گیا۔ جب ذہانت خاموش ہو تو تجربہ بول پڑتا ہے۔ جب خیالات خاموش ہوجائیں تو بیدار ذہانت آموجود ہوتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ زندگی کے بنیادی سوال کا کوئی جواب نہیں۔ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں، اسے چھوڑ دو۔ سوال کو لو اور ذہن کو خالی کردو۔ سوچنے کی قوت صرف یہ کہہ سکتی ہے کہ۔ اس سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ جواب صرف خاموشی سے ہی آتا ہے۔

اس حقیقت کو جاننے کے بعد، زندگی کے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ذہن کی یہ کیفیت گیان دھیان، مراقبہ یا روشن خیالی کہلاتی ہے۔

پوچھو اور خاموش ہوجاؤ۔ بالکل خاموش، مسئلے کے حل کو اپنی مرضی سے آنے دو۔ جواب کے پھل اپنے تئیں آنے دو۔ خاموش ذہن ہی دیکھے گا کہ میں کون ہوں۔

زندگی کی سچائی کی پیاس، خود کو جانے بغیر نہیں بجھائی جاسکتی۔ اور خود اپنی ذات تک پہنچے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام راستوں کو چھوڑ دیا جائے۔

جب ذہن کسی راستے پر بھی نہیں ہوگا تو ہی خود تک یعنی ذات تک پہنچے گا۔ جب ذہن کے سامنے کوئی راستہ نہ ہوتو اسکی توجہ اپنی ذات پر ہوگی اور ذات کی پہچان ہی سچی

پہچان ہے، باقی باتیں صرف معلومات ہیں اور معلومات بھی ضمنی ۔ سائنس سچا علم نہیں ہے۔ سائنس سچائی کا علم نہیں، یہ تو صرف سچائی کا استعمال جانتی ہے۔ حقیقت یا سچائی صرف براہ راست ہی جانی جاسکتی ۔ اور کوئی بھی وجود جسے براہ راست کہا جائے وہ اپنی ذات ہوتی ہے۔

جب ذہن خاموش اور ساکت ہوتو کاملیت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور سچائی ملنے لگتی ہے۔

اور شعور کو دیوتائیت حاصل ہوجاتی ہے سچائی جاننے کی پیاس ،صرف دیوتائیت سے ہی بجھ سکتی ہے۔

16

یہ گزشتہ رات ہے۔ میں ابھی ایک محفل سے واپس آیا ہوں جہاں ایک شخص نے کہا تھا۔" اپنے رب کو پکارو، یادرکھو اسکا نام زبان سے باربار ادا کرو، اگرتم نے اسے دل کی گہرائیوں سے پکارا تو وہ ضرور سنے گا۔" مجھے یاد دلایا گیا کہ کبیر نے کیا کہا تھا۔"کیا بھگوان بہرا ہو چکا؟"

شاید کبیر کے الفاظ اس شخص تک نہیں پہنچے تھے۔

پھر میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔" دس آدمی سو رہے ہیں ۔کوئی ایک کہتا ہے۔ یہ صرف دیوتا ہے جو بیدار ہوتا ہے۔ بھگوان سے متعلق یہ بات سچ ہے۔ اسکا نام پکارو اور وہ تمہاری دعا ضرور سنے گا۔"

اس کے الفاظ سننے کے بعد میں ہنسنے پر مجبور ہوگیا۔ پہلی بات تو یہ کہ بھگوان نہیں سو رہا ہے بلکہ یہ ہم ہیں جو سو رہے ہیں ۔ وہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ یہ وہ نہیں جسے بیدار کیا جائے بلکہ یہ ہم ہیں ۔سونے والوں کو بیدار ہونا چاہئے ۔

ہمیں اس کو پکارنے کی ضرورت نہیں ۔ ہمیں اسکی آواز سننی چاہئے جو ہمیں پکار رہا ہے، متوجہ کررہا ہے۔ اور یہ صرف خاموش اور سکوت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ صرف اس گھڑی جب ذہن مکمل طور پر آزاد ہو، کوئی خلل نہ پڑ رہا ہو۔ جب ذہن میں کسی قسم کی آواز نہیں ہوگی تو یہ گونج ، یہ بازگشت سنائی دیگی ۔

مکمل خاموشی اور سکوت ہی ، دعا ہوتی ہے۔ دعا کوئی عمل نہیں بلکہ اسکے متضاد، جب ذہن کسی کام میں مشغول نہ ہوتو عبادت اور دعا کررہا ہوتا ہے۔

دعا کوئی مشغلہ نہیں بلکہ انسان کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ آقا یا بھگوان کا کوئی نام نہیں ۔ وہ ہوا کی شکل میں بھی نہیں ۔ چنانچہ اسے پکارنے اور یاد کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ۔ تمام نام ، تمام شکلیں تصوراتی ہیں۔ وہ سب غلط اور جھوٹی ہیں۔ ہم نام اور شکلوں کو چھوڑ کے سچائی اور حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ ان پر بھروسہ کرتے ہوئے نہیں۔

جو ان باتوں کو چھوڑنے کی جرأت کرتے ہیں وہ ہی اس تک پہنچ سکتے ہیں۔

میں نے سنا۔

ایک فقیر بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور اسکی نگاہیں کمزور تھیں۔ وہ ایک مسجد کے باہر کھڑا دست سوال دراز کئے ہوئے تھا۔ ایک گزرتے ہوئے شخص نے کہا۔ ''بہتر ہوگا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ کسی کا مکان نہیں ہے کہ وہ تمہیں کچھ دیدے۔'' فقیر نے پوچھا۔ ''کون گھر والا ہوسکتا ہے جو کسی کو کچھ نہ دے۔'' راہ گیر نے جواب دیا۔ ''پاگل آدمی، کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ ایک مسجد ہے؟ اس گھر کا مالک گریٹ فادر ہے، خود خدا۔''

فقیر نے سر جھکا کر مسجد کو دیکھا۔ اس کا دل پیاس سے بھر گیا۔ اس کے اندر کی ایک آواز بولی۔ میں اس در سے کس طرح ہٹ سکتا ہوں؟ یہی تو اصل در ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کونسا در ہے؟ اس میں ایک مضبوط عزم پیدا ہوا۔ ایک بہت بڑی چٹان جیسا عزم اور اس کے دل نے صدا لگائی۔ ''میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ اسے بعد میں کیا ملا۔ جو لوگ خالی ہاتھ جانے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ملتا۔''

وہ مسجد کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے خالی ہاتھ آسمان کی طرف بڑھائے۔ وہ پیاسا تھا۔ پیاس بجائے خود دعا ہوتی ہے۔ دن گزرتے رہے، مہینے بیت گئے۔ گرمیاں گزر گئیں۔ موسم برسات ختم ہوا۔ موسم سرما بھی قریب قریب جاتا رہا۔ ایک برس ہو گئے۔ بوڑھے شخص کے کوچ کا وقت قریب تر ہو گیا۔ لیکن اسکی زندگی کے اختتام کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ وہ رقص کر رہا ہے۔

اس کی آنکھوں میں بے انتہا چمک تھی۔ اس کے بوڑھے جسم سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے کسی سے کہا۔ ''وہ کہتا ہے صرف ایک چیز حاصل کرو، ہمت، جرأت، خود اپنی ذات سے دست برداری جرأت ہے۔

اپنی ذات سے دست برداری کی ہمت۔

اپنی ذات کو پس پشت ڈال دینے کی ہمت۔

اپنی ذات کی نفی کر دینے کی ہمت۔

جو خود اپنی نفی کر دے وہی کچھ پاتا ہے۔ وہ شخص جس میں مرنے کی خواہش ہو، وہی زندگی پاتا ہے۔

ایک دن علی الصبح، بدھا گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی اس نے گفتگو شروع نہیں کی تھی کہ دروازے پر ایک چڑیا نغمہ سرا ہوئی۔ صبح خاموش اور سہانی تھی۔ بدھا چپ اور خاموش رہا صبح کے آفتاب نے اپنی کرنوں سے نقش ونگار بنا شروع کیا اور چڑیا گاتی رہی جبکہ بدھا بدستور خاموشی اختیار کئے رہا۔ اس خاموشی میں چڑیا کے نغمے نے تقدس اختیار کرلیا۔ نغمے کے ختم ہوتے ہی سُونا پن گہرا ہو گیا۔

پھر بدھا کھڑا ہوا۔ اس دن اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس دن خاموشی بجائے خود گفتگو تھی۔

اس نے خاموش رہ کر جو پیغام دیا وہ لفظوں کے ذریعے ممکن نہیں تھا۔

اس زندگی میں، اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا یا دیوتا کا ہے، مکمل طور پر خدائی۔ ہر چیز میں خدا ہی کا نقش اور جلوہ ہے، وہی ہر چیز میں پوشیدہ اور پنہاں ہے۔ وہ اور صرف وہ ہر جگہ آشکار اور روشن ہے۔ ہر شکل، ہر نقشہ اسی کا ہے۔ تمام آوازیں اسی کی ہیں۔ لیکن جب ہم خاموش نہ ہوں تو اسے نہیں سن سکتے اور چونکہ ہماری آنکھیں بند ہوتی ہیں اس لئے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

ہمارا دماغ حاضر ہوتا ہے اس لئے وہ غیر موجود ہوتا ہے

اگر ہمارا ذہن خالی ہو تو وہ یہاں موجود ہوگا اور اب بھی موجود ہے۔

یہی سچائی اور حقیقت ہے لیکن جب ہمارا وجود بے شعور ہو۔ بالکل ویسے ہی جیسے روشنی تو ہو لیکن ہماری آنکھیں بند ہوں۔ ہم نے اپنے وجود، اپنی ذات کو بیدار نہیں کیا لیکن حقیقت کی تلاش شروع کردی۔ ہم نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں لیکن روشنی کے طلبگار ہو گئے۔

اس قسم کی غلطیاں کبھی نہ کرو۔ تمام خواہشات کو پس پشت ڈالتے ہوئے خاموشی اور سکوت اختیار کرو۔ اپنے دماغ کو ساکن کرو اور سنو۔ آنکھوں کو کھلا رکھو اور دیکھو۔ اگر کوئی پانی کی مچھلی سمندر کی تلاش کا مشورہ مانگے تو اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں کہوں گا۔ ''تلاش چھوڑ دو۔ صرف دیکھو۔ تم تو پہلے ہی سمندر میں موجود ہو۔''

ہر شخص، تمام لوگ سمندر میں ہیں۔ مسئلہ اسکی تلاش کا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ اسے پینا شروع کرو۔

19

پڑوس میں ایک مندر ہے۔ ہر دن رات دیر تک وہ پوجا پاٹ کیا کرتے اور بھجن وغیرہ گایا کرتے ہیں۔ لوبان کی دھونی سے پیدا ہونے والی تیز خوشبو پوری عبادت گاہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ عبادت اور چڑھاوا وغیرہ شروع ہوتا ہے۔ موسیقی کے مختلف ساز آواز پیدا کرتے اور گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ڈھول پٹنے لگتے ہیں۔ گھنٹہ بجنے لگتا ہے۔ سادھو رقص کرنے لگتے ہیں جسمیں رفتہ رفتہ پجاری شامل ہوتے جاتے ہیں۔

ایک دن میں یہ سب کچھ دیکھنے کی غرض سے مندر گیا۔ وہاں میں نے جو دیکھا وہ عبادت نہیں تھی بلکہ بے شعوری کی ایک قسم تھی۔ یہ دعا کے نام پر خود فراموشی تھی۔ اگر تم خود کو بھول جاؤ تو اپنے تمام دکھ درد بھول جاؤ گے۔ اس قسم کے مذہبی طریقے ویسے ہی ہیں جیسے نشے کی بے خودی۔

دنیا میں ایسا کون شخص ہے جو اپنی زندگی کے دکھ درد سے فرار کی خواہش نہیں رکھتا۔ نشہ باز یہی تو کرتے ہیں۔ نشے سے بے خود کر دینے والی اشیاء اسی لئے تو ایجاد کی گئی ہیں۔

انسان نے بہت ساری اقسام کی شرابیں کشید کر رکھی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مہلک شراب بوتلوں میں نہیں ملتی۔ رنج و غم بھولنے سے ختم نہیں ہو جاتا۔ انکے بیج ان طریقوں سے ضائع نہیں ہوتے بلکہ انکی جڑیں قوی تر ہوتی جاتی ہیں۔

رنج والم کو مٹنا تو چاہئے لیکن بھول کر نہیں۔ بھولنا مذہبی نہیں بلکہ خود فریبی ہے۔

جیسے خود فراموشی غم غلط کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ غم والم پر قابو پانے کا طریقہ خود آگاہی ہے۔

حقیقی مذہب وجود کو مکمل طور پر بیدار کر دیتا ہے۔ مذہب کے دوسرے طریقے جھوٹے ہیں۔ صحیح راستہ صرف خود آگاہی ہے جبکہ خود فراموشی کہیں دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اپنے وجود کو فراموش کرنے سے وجود مٹ نہیں جاتا۔ اس میں چھپی ہوئی قوت بہتی رہتی ہے۔ خود آگاہی کے ذریعے ہی وجود کو پس پشت ڈالا جا سکتا ہے۔ وہ شخص جو اپنے وجود سے مکمل آگاہی رکھتا ہو، اپنے وجود کی نفی کے بعد منزل پا سکتا ہے۔ کُل کا راستہ فراموشی سے نہیں بلکہ وجود کی غیر موجودگی (Disappearance) سے حاصل ہوتا ہے۔ خود فراموشی سے خدا کو یاد کرنے کی کوشش کرنا سوئے فکر یا خام خیالی ہے۔ راستہ وہی ہے کہ

وجود کو آگاہی کے ساتھ کچل کر اختیار کیا جائے۔

اور جب وجود غیر موجود ہوتا ہے تو وہاں صرف خدا رہ جاتا ہے

خدا اسی وقت ملتا ہے جب وجود ملیا میٹ ہو جائے ذات یا اپنے آپ کو فراموش کرنے سے نہیں ملتا۔

شام سے ہی موسم بھیگا بلکہ طوفانی تھا۔ ہوا کے تیز تھپیڑوں سے درخت ہل رہے تھے۔ الیکٹرک فیل ہوگئی اور پورا شہر اندھیروں میں ڈوب گیا۔

گھر کے اندر مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کردیا گیا۔ چراغ کی لو اوپر ہے۔ لیمپ مٹی کا ہے لیکن اسکی لو اوپر بڑھ کر کسی نادیدہ چیز کو چھولینا چاہتی ہے۔

انسانی شعور اس لو جیسا ہی ہے۔ انسان مٹی کا ہے لیکن اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو مسلسل اوپر بڑھنا چاہتی ہے۔ یہی شعور، یہی رقص کرتا ہوا شعلہ یا لو انسان کی زندگی ہے۔ یہی نہ ختم ہونے والی آرزو جو اوپر اٹھنا چاہتی ہے اسکی روح ہے۔ آدمی، آدمی ہے کیونکہ اسکے اندر یہی موجود ہے۔ اسکے بغیر وہ مٹی کے سوا کچھ نہیں۔

اگر چراغ کی اس لو (Flame) میں تندی اور غضبناکی ہو تو زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ اگر یہ لو مکمل طور پر ظاہر اور آشکار ہو تو وجود کی مٹی بھی برتر ہوجاتی ہے۔

انسان ایک لیمپ جیسا ہوتا ہے۔ اس میں مٹی کے ساتھ ساتھ روشنی بھی ہوتی ہے۔ اگر وہ خود کو صرف مٹی سمجھتا رہے تو زندگی بیکار محض ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کی بھرپور توجہ لائٹ یا روشنی کی طرف بھی ہونی چاہئے۔

روشنی سے آگاہی ہر چیز کو تبدیل کردیتی ہے اور پھر انسان مٹی میں بھی خدا کا جلوہ دیکھ لیتا ہے۔

صبح کا اختتام ہوا۔ آفتاب قوی تر ہوگیا اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ سائے میں چلوں۔

ایک عمر رسیدہ اسکول ٹیچر منتظر ہے۔ وہ برسوں سے روحانیت کی مشق کررہا ہے۔ اسکا جسم کمزور اور لاغر ہے، اسکی آنکھیں دھنسی ہوئی اور پژمردہ ہیں۔ وہ خود کو اذیت دیتا رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ اذیت روحانیت تک لیجائے گی۔

جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں زہر آلود ہوچکی ہیں جو حق کے راستوں پر چلنے کے لئے اس قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ وہ لوگ خدا کو پانے کے لئے دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور روح کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں جسم کو تباہ کردیتے ہیں۔ غلط طریقے انہیں تباہ کردیتے ہیں اور وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ دنیا کو چھوڑ دینے سے خود انہیں کیا مل پاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جسم کشی کرنے والوں کا یقین دراصل جسم پر ہی ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو دنیا کو نظرانداز کردیتے ہیں انکے ذہنوں پر دنیا مسلط ہوتی ہے۔ جبکہ زہد دنیا کو لذتیت (اخلاقیات کا نظریہ کہ لذت اندوزی ہی خیر اعلیٰ اور انسانی اعمال کا مقصود ہے یا ہونا چاہئے) سے کم کا پابند نہیں کرتا۔

حقیقی روحانیت نہ تو جسم کو رد کرتی ہے اور نہ دنیا کو یہ تو اسے برتر و فائق سمجھتی ہے۔

وہ نہ تو عیش کوشی سے حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی عمل کو جبراً روک دینے سے۔ وہ راستہ ان دونوں سے بالکل مختلف ہے۔ تیسرا راستہ، توازن کا راستہ ہے۔ اور توازن دو انتہاؤں کے درمیان یا بیچ میں ہوتا ہے یعنی دونوں مقناطیس کے عین درمیان۔

حقیقت یہ ہے کہ توضیحاً اسے درمیان کہا جاتا ہے جو دونوں انتہاؤں سے الگ تھلگ ہوتا ہے۔ عیش کوشی اور کسی عمل کو روک دینے کے درمیان توازن کا مطلب ہے کہ نہ ادھر ہوں اور نہ اُدھر۔ یہ کوئی بیچ کی راہ بھی نہیں بلکہ توازن ہے جبکہ انتہا پر عدم توازن ہے اور عین درمیان میں توازن ہے۔ انتہا پر تباہی ہے، درمیان میں زندگی ہے۔

انتہا پر جانے کا مطلب بربادی ہے۔ دونوں یعنی عیش کوشی اور استیصال (Suppression) زندگی کو برباد کردیتے ہیں۔ عدم توازن بے علمی، اندھیرا اور موت ہے۔

میرا روحانی ظابطہ توازن اور خوش آہنگی یا تناسب ہے۔ جب وینا (Veena) کے تار نہ تو ڈھیلے ہوں اور نہ بہت سخت تنے ہوئے تب ہی موسیقی کی مدھر آواز نکلتی ہے۔ ڈھیلے تار بھی سخت تنے ہوئے تاروں کی طرح غیر موثر ہوتے ہیں۔ تاروں کو اس جگہ ہونا چاہئے جہاں نہ تو سخت ہوں نہ ڈھیلے۔ یہی متوازن جگہ دل پذیر موسیقی کا باعث ہوگی اور یہی جگہ متوازن ہوگی۔

موسیقی کا قانون اور قانون توازن ایک جیسے ہیں۔ حقیقت تک توازن کے ذریعے ہی پہنچا جاسکتا ہے۔

میں نے توازن کے اس اصول کو اسکول ٹیچر کے سامنے پیش کیا اور لگا کہ جیسے وہ اس پر توجہ دے رہا ہے۔ یہ تاثر اسکی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو رہا ہو۔ وہ خاموش اور پرسکون تھا جیسے ٹینشن سے آزاد ہوکر کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ ''اپنے ٹینشن سے فراغت پالو اور دیکھو۔ تم نے اپنی دلچسپیاں ہی نہیں چھوڑ رکھی میں بلکہ (Supperssion) استیصال بھی دور رکھا ہے۔ ان سب باتوں کو چھوڑ واور دیکھو۔

قدرتی انداز اختیار کرو اور دیکھو۔ ہم صرف قدرتی انداز میں ہی صحت مند اور اپنے اندر تک پہنچ سکتے ہیں۔''

میری بات کے جواب میں اس نے کہا۔ ''چھوڑ دینے کے لئے اب بچا ہی کیا ہے؟ وہ تو پہلے ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں انتہائی پرسکون اور کسی بار کے بغیر واپس جا رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کسی خوفناک خواب کا اختتام ہوگیا۔ میں تمہارا بہت بہت شکر گزار ہوں۔'' وہ مطمین تھا اور اسکی آنکھوں میں معصومیت بھی تھی۔ اسی طرح اسکے چہرے پر دل آویز اور معصوم مسکراہٹ رخصاں تھی۔

بڑھاپے کے باوجود وہ ایک بچہ لگ رہا تھا۔

میری خواہش ہے کہ ہر ایک شخص جو خدا کا متلاشی ہے اسپر یہ باتیں واضح ہوجائیں۔

22

اگر تم حقیقت تک پہنچا چاہتے ہو تو ذہن کو پس پشت ڈالدو جیسے کہ ذہن موجود ہی نہیں ہے پھر حقیقت آشکار ہوجائے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے دروازہ کھولتے ہی سوچ کی کرنیں در آتی ہیں۔ ایک دیوار کی مانند ذہن حقیقت کو روک دیتا ہے۔ اور اس دیوار میں لگی ہوئی اینٹیں خیالات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ خیالات ۔ خیالات اور مزید خیالات ۔ انہی خیالات کی زنجیر ذہن کو گھیرے رکھتی ہے۔ دانشمند رامانا (Ramana) نے ایک بار کسی سے کہا تھا۔ ''اپنے خیالات کو روکنے کے بعد مجھے بتاؤ کہ ذہن کہاں ہے۔''

اگر خیالات نہ ہوں تو ذہن بھی نہیں ہوتا۔ اگر اینٹیں نہ ہوں تو دیوار نہیں بن سکتی؟

گزشتہ شب ایک راہت میرے پاس آیا۔ ''میں اپنے ذہن کو کیا کروں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اس کے ساتھ کچھ نہ کرو، اسے تنہا چھوڑ دو اور دیکھو۔ اسے قطعی اکیلا چھوڑ دو اور دیکھتے جاؤ۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص دریا کے کنارے بیٹھا ہوا اسکے بہاؤ کو دیکھتا ہے۔ تم اپنے خیالات کے بہاؤ کو دیکھتے رہو۔ خود کو اسے نہ پہنچواؤ۔ اس کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ ظاہر کرو۔ بس دیکھتے رہو۔ جیسے کوئی مستعد شخص دیکھتا ہے۔ جب تم دیکھو گے تو تمہارے خیالات غائب ہوجائیں گے اور تمہارا ذہن چھپ جائیگا۔''

ذہن کے چھپتے ہی ۔ اس خالی جگہ تمہیں روح دکھائی دیگی اور یہی حقیقت ہوگی، کیونکہ صرف وہی ہوگی۔

23

ایک سرد اندھیری رات میں ایک راہب عبادت گاہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اسنے مندر کے ایک بت کو جو لکڑی کا بنا ہوا تھا، آگ لگائی۔ اتنے میں مندر کا پجاری بیدار ہو گیا۔

اس نے جب بت کو جلتا ہوا دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ اسے اتنا شدید غصہ تھا کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔ یہ بات ہی ایسی تھی جسے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ راہب راکھ کے ڈھیر میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ مندر کے پجاری نے اس سے پوچھا۔ ''تم اب کیا کر رہے ہو؟'' راہب نے جواب دیا۔ ''میں دیوتا کی ہڈیاں تلاش کر رہا ہوں'' یہ سنکر راہب کا پاگل پن پجاری کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے راہب سے کہا۔ ''پاگل آدمی، لکڑی کے بت میں ہڈیاں کہاں سے آ گئیں؟'' راہب نے جواب دیا۔ ''پھر برائے مہربانی مجھے ایک دوسرا بت فراہم کرو رات طویل اور بہت سرد ہے۔''

مجھے جب یہ کہانی یاد آتی ہے، تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ پاگل راہب میں خود ہوں۔

ہم جب ان تصورات سے نکلیں گے تو ہی کچھ دیکھ سکیں گے۔ اگر کسی شکل پر زور دیتے رہیں گے تو اصلیت آشکار نہ ہو سکے گی۔ جب آنکھیں بیرونی مناظر پر لگی ہوں تو ہم لامتناہی سمندر میں کیونکر چھلانگ لگائیں گے؟ کیا ایک ایسا شخص جو اپنے سے باہر کسی چیز کو پوجتا ہو وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھ سکتا ہے؟ مادّی فضولیات کو آتش برد کر دو کہ غیر مادّی وجود رہ جائے۔ بادلوں کی شکلوں کو اڑا دو تا کہ حقیقی آسمان تک پہنچ سکو۔ ان شکلوں کو پگھلا دو تا کہ کشتی سمندر میں غیر مادّی حقیقت تک پہنچ سکے۔ وہ لوگ جو اپنے محدود ساحل پر کشتی کی ابتدا کرتے ہیں بالآخر لامحدود تک پہنچ جاتے ہیں اور اس میں باہم ملکر ایک ہو جاتے ہیں۔

24

عبادت اور دعا کیا ہوتی ہے؟۔ کیا یہ خود کو بھولجانے کا عمل ہوتا ہے؟ نہیں یہ خود کو بھولجانے کا عمل نہیں ہوتا۔ خود فراموشی مدہوشی۔ خود اپنے وجود کو ناکامی کی نذر کرنا۔ نشے جیسی بات ہے۔ ایسے طریقہ کار کو عبادت نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو محض فرار ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص الفاظ اور نغموں میں کھو جائے اور موسیقی اور رقص کے سحر میں بھول جائے۔ یہ بھول اور دوری بھی دلچسپ ہو سکتی ہے لیکن یہ عبادت نہیں ہے۔ یہ بے شعوری ہے، عبادت بہرحال شعور اور آگاہی کی متقاضی ہوتی ہے۔

کیا عبادت ایک مشغلہ ہے؟ کیا کچھ کرنا عبادت کا طریقہ ہے؟

جی نہیں عبادت کوئی مشغلہ نہیں، یہ شعور کی ایک کیفیت ہے۔ عبادت یہ نہیں کہ ہم کچھ کریں۔ یہ غیر فعالیت کا جوہر ہوتی ہے۔ جب تمام مشاغل ختم ہو جائیں اور صرف تصدیقی شعور رہ جائے تو وہ عبادت ہے۔ لفظ عبادت میں مشغلہ پنہاں ہے اسی طرح مراقبے میں بھی مشغلہ موجود ہے لیکن ان دونوں الفاظ کو مشغلہ یا کچھ کرنے کے معنوں میں نہیں لیا جانا چاہئے بلکہ اسکے بجائے ایک شعوری کیفیت کو سمجھنا چاہئے۔ خود کی نفی کے بعد عدم وجود، خاموشی، بے زبانی۔ یہ عبادت ہے۔ یہی مراقبہ ہے۔

میں نے گزشتہ کل، ایک عبادتی تقریب میں اسکا ذکر کیا تھا۔

بعد میں کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ''پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

میں نے جواباً کہا۔ ''تھوڑی دیر تک کچھ مت کرو۔ مکمل طور پر پُرسکون ہو جاؤ۔ اپنے جسم اور ذہن کو خاموش اور ساکت کر دو۔ پھر اپنے ذہن کا مشاہدہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ ساکت اور خالی ہے۔ اسی خالی پن میں ہم حقیقت سے قریب ہو جائیں گے۔ اس خالی پن میں، اندر و باہر دونوں ذہن پر روشن ہونگے۔ پھر اندر اور باہر دونوں غائب ہو جائیں گے اور خالص وجود رہ جائے گا۔ اسی خالص وجود کو خدا کہتے ہیں۔''

شام، رات سے ملجاتی ہے۔ کچھ لوگ آئے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''تم عدم وجود کی تعلیم دیتے ہو۔ لیکن عدم وجود کے خیالات ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم پکڑ سکتے ہوں؟''

میں کہتا ہوں کہ اس خالی پن کو حاصل کرنے کے لئے بے خوفی ضروری ہے۔ لیکن جو اندر جست لگاتے ہیں وہ عدم وجود تک نہیں پہنچتے۔ انہیں خالی پن نہیں ملتا۔ اور وہ جو کسی چیز کو گرفت کئے رکھتے ہیں انہیں بھی کچھ نہیں ملتا۔

حقیقت تک صرف اسی وقت پہنچا جاسکتا ہے جب ذہن یکسر خالی ہو۔ اور اس خالی پن میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے ذہن منسلک رہے۔ میں انہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔

''ایک تاریک رات میں ایک مسافر انجانے پہاڑی راستے سے پھسل کر ایک گہری کھائی میں گرنے لگا۔ وہ ایک جھاڑی کو پکڑ کر جھولنے لگا۔ وہاں چاروں جانب سخت اندھیرا تھا۔ نیچے بھی تاریکی اور خوفناک گہرائی۔ کافی دیر تک وہ جھاڑی پکڑے جھولتا رہا اور پورے وقت تک اسے موت نظر آتی رہی۔ یہ ایک سرد رات تھی، رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ سرد ہو کر بے جان سے ہوتے گئے۔ جلد ہی اس کی گرفت ڈھیلی ہو جائے گی اور وہ کھائی میں گر جائے گا۔ وہ کچھ بھی کرلے خود کو نہیں بچا سکے گا۔ وہ پہلے ہی موت کا جبڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا۔۔۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وہاں سرے سے کوئی کھائی تھی ہی نہیں۔ اس لمحے جب وہ گرا تو اس نے دیکھا کہ وہ زمین پر کھڑا ہوا ہے۔''

اس قسم کا تجربہ مجھے بھی ہو چکا ہے۔ خالی پن میں گرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں خالی پن میں نہیں بلکہ زمین پر ہوں۔ ذہن کے سہارے کو چھوڑ کر میں نے تقدس پالیا۔

خالی پن میں جست لگانا ہی دراصل جرأت ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنے خالی پن میں کودنے کا حوصلہ نہیں رکھتے وہ ناکام رہتے ہیں۔

میں صبح کی چہل قدمی سے واپس گھر آ رہا تھا۔ دریا کے ساحل پر چلتے ہوئے میں ایک چھوٹی سی نہر کے قریب پہنچا۔ رستے کی پتیوں کو صاف کرتے ہوئے پانی کا ریلہ تیزی سے دریا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس ریلے کی تیز رفتاری اور دریا میں مل جانے کے عمل کو دیکھا۔ پھر میری نگاہ دریا کی شتابی یا سرعت رفتاری پر پڑی۔

اس کے بعد مجھے لگا کہ ہر چیز عجلت میں ہے تاکہ جا کر سمندر سے مل جائے اور اپنے مقصود کو پالے اس عمل کے دوران پانی کا ریلا راستے کی خشک پتیوں کو ہٹاتے ہوئے بڑھتا رہا۔

پانی کا ہر ایک قطرہ سمندر میں مل جانا چاہتا ہے۔ یہ زندگی کی بنیادی خواہش ہوتی ہے۔ ہماری تمام تر جدوجہد اسی خواہش کی مرہون منت ہوتی ہے اور جب اس کی خواہش پوری ہو جائے تو ہم حقیقی خوشی اور راحت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ محدود یا ناتمام ہونے کی صورت میں ملال اور رنج و غم ہوتا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ کیونکہ ہم محدود اور ناتمام ہوئے اور زندگی کا اختتام موت پر ہوا۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی لافانی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو وہ غیر منقسم اور سالم ہوتی ہے۔

لیکن انسان اپنی خودی کے قطروں کی طرح رک جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ زندگی کے نہ ختم ہونے والے بہاؤ سے الگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی خواہش سے سورج کی شعاعوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اور مٹی کے تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی میں کام سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے اطمینان نہیں مل سکتا جیسے ایک قطرۂ آب اگر الگ رہنا چاہے تو ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اسکا کوئی جواب نہیں سوائے اس کے کہ قطرہ سمندر میں ملجائے۔ کیونکہ قطرے کی منتہا اور منزل تو سمندر رہے۔ قطرے کو تو سمندر بننا ہوتا ہے۔ قطرے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی پستی ختم کرلے۔ اسکے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی انفرادی ذات کو ختم کرلے۔

یہ سمندر ہونے کی تکمیل ہے جو حقیقت بنجاتی ہے۔ اور یہی تکمیل ہے جو بیرونی غلبے سے آزادی دلاتی ہے۔ پھر وہ جس نے تکمیل نہ کی کیونکر بیرونی غلبے سے بچ سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا۔ ''جو شخص اپنی زندگی بچانے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے گنوا

دیتا ہے اور جو اسے گنواتا ہے اسے حاصل کر لیتا ہے۔"

اسی طرح مجھے بھی کہنے دیں کہ یہی محبت ہے، خود اپنی ذات کو گنوانا ہی محبت ہے۔ موت کو قبول کرنا محبت اور پیار ہے، یہی وہ راستہ ہے جس سے زندگی کو دوام نصیب ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے جو میں کہتا ہوں ۔"قطرہ سمندر کی طرف بڑھنے کے لئے عجلت کرتا ہے۔ کیونکہ سمندر ہی تو تمہاری آخری منزل ہے۔ محبت میں موت کو خوشی اور مسرت سے قبول کرو کیونکہ وہی اور صرف وہی زندگی ہے۔ سمندر سے پہلے رکنا تباہی، لیکن سمندر تک پہنچ جانے کا مطلب موت سے افضل ہے۔"

27

ایک راہب کا شاگرد مر گیا۔ راہب اپنے شاگرد کے گھر گیا جہاں شاگرد کا جسد خاکی رکھا ہوا تھا اور لوگ رو رہے تھے۔ راہب پہنچا تو بلند آواز سے پوچھا۔"کیا وہ شخص مر گیا یا زندہ ہے؟"

ماتم گسار حیرت اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ سوال کیوں پوچھا گیا؟ جسد خاکی تو پڑا ہوا ہے۔ کیا کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے؟

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر ایک شخص نے راہب سے پوچھا۔"جناب والا، کیا آپ اپنے سوال کا خود جواب دے سکتے ہیں؟"

تمہیں معلوم ہے کہ راہب نے کیا جواب دیا تھا؟ اسنے کہا۔"کہ جو مرا وہ مر گیا، جو ابھی تک زندہ ہے، وہ زندہ ہے۔" ان دونوں کے درمیان بس یہی تعلق ہے۔

زندگی مرتی نہیں اور موت زندہ نہیں رہتی۔ جو لوگ نہیں جانتے وہ زندگی کے اختتام کے لئے موت کے خواستگار ہوتے ہیں۔ لیکن نہ تو پیدائش زندگی کی ابتدا ہوتی ہے اور نہ موت زندگی کا اختتام۔ زندگی پیدائش اور موت کے اندر ہوتی ہے اور اسکے بعد بھی۔ یہ پیدائش اور موت زندگی میں ہی ہوتی ہے لیکن زندگی خود پیدا نہیں ہوتی اور مرتی بھی نہیں۔

میں ابھی ابھی ایک کریا کرم سے واپس آیا ہوں۔ جب میت کو آگ لگائی گئی تو لوگوں نے کہا۔"لو سب کچھ ختم ہو گیا۔"

میں نے کہا۔"کیونکہ تمہارے پاس آنکھیں نہیں ہیں اس لئے تمہیں ایسا دکھائی دے رہا ہے۔"

28

میں ابھی ایک سفر سے واپس لوٹا ہوں جس کے دوران میری ملاقات سادھوؤں سے ہوئی ۔ سادھوتو ہرجگہ ہو تے ہیں لیکن مراقبہ انکی پوری زندگی میں کہیں نہیں ہوتا ۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں ہیں لیکن اسی طرح جیسے مصنوعی پھول۔

مراقبے کے بغیر مذہب ناممکن ہے ۔ مذہب کے نام پر آج کل کیا ہورہا ہے صرف غیر مذہبیت کومضبوط کرنا۔ سطح پرتو مذہب ہوتا ہے لیکن اندر لا مذہبیت ۔

اور یہ قدرتی امر ہے۔تم کسی پودے کو جڑ کے بغیر زمین میں گاڑ سکتے ہو۔ وہ کسی پارٹی کو ڈیکوریٹ تو کر سکتے ہیں لیکن کیا وہ بڑھکر پھول اور پھل پیدا کر سکتے ہیں؟

مذہب کی جڑیں مراقبے اور یوگا میں ہوتی ہیں ۔ یوگا کے بغیر ایک سادھو کی زندگی بناوٹ اور خودفریبی کے سوا کچھ نہیں یا پھر کسی عمل کو روک دینا۔ اور یہ دونوں ہی بے وقعت چیزیں ہیں۔

خوش اطواری کا ڈھونگ ، ریا کاری اور منافقت ہے اور کسی عمل کو روکنا بھی مہلک اور پُر ہلاکت ہوتا ہے۔ دونوں میں کوشش اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ روک دینے کا عمل ختم نہیں ہوتا۔ یہ آہستگی کے ساتھ وجود کے اندر چلا جاتا ہے۔ اسکی انتہا پر عیش کوشی کی لذت مچلنے لگتی ہے ، حدت اور زندگی کا بخار اسکے اپنے شعلوں میں خاکستر ہوجاتا ہے اور اسے نہ بجھنے والی پیاس کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ دوسری انتہا پر ہم دیکھتے ہیں کہ عمل کو ردکردینے کے باعث ایک دوسری آگ روشن ہے یعنی خود کو اذیت دینے کی آگ۔ اگر ایک انتہا سے فرار ہوں تو کنویں سے بچکر کھائی میں گر جاتے ہیں۔

یوگا نہ تو عیاشی کا مشغلہ ہے اور نہ کسی عمل کو روکنا۔ بلکہ یہ تو دونوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں سے بچنا چاہئے ۔ہم ان دونوں میں سے کسی کو بھی اچھانہیں سمجھتے ۔ وہ جوانمیں سے کسی کو بھی اپنا تا ہے وہ خودکو اسکا غلام بنا دیتا ہے۔ یوگا کا تعلق اس طرح کی کسی چیز سے نہیں ہوتا ۔ وہ ہر پیوستگی کا مخالف ہے۔ یہ کسی چیز کو چھوڑ کے کسی دوسری کو نہیں پکڑتا۔ وہ قطعی الگ رہتا ہے۔ تمام پیوستگی چھوڑ دیتا ہے۔ منسلک یا پیوستہ رہنا بجائے خود غلطی ہے۔ یہی چیز تو کسی کو کنویں یا پھر کھائی میں لیجاتی ہے۔ جب کہ صحیح راستہ وہ ہے جسمیں کوئی انتہا نہ ہو، کوئی دہراپن ، کوئی جدوجہد۔

انتخاب نہ کرو بلکہ شعور میں اتر و وہ منتخب کریگا۔ دہرے پن میں گرفتار نہ ہو بلکہ جاننے کی کیفیت میں چلو جسکی نگاہیں دہرے پن کو دیکھ رہی ہیں ۔ یہی حرکت یا جنبش تو حقیقی شعور ہے اور یہی شعور روشنی کا دروازہ۔

وہ دروازہ قریب ہے۔ جو لوگ اپنے شعور کی لوکو دہرے پن کے طوفان سے محفوظ رکھتے ہیں،وہ اس چابی کو پالیتے ہیں جس سے سچائی اور حقیقت کے ہر دروازے کو کھولا جاسکتا ہے۔

میں لوگوں کے اژدہام کو دیکھتا ہوں اور مجھے انپر رحم آتا ہے۔ وہاں تھوڑی سی بھی خالی جگہ نہیں جہاں انپر صاف آسمان ہو۔ جن پر تھوڑا سا بھی کھلا آسمان نہ ہو وہ کیونکر بیرونی غلبے سے آزاد رہ سکتے ہیں؟ بیرونی غلبے سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انکے اندر کھلا آسمان ہو، باہر کا آسمان نہیں۔ جنکے اندر کھلا آسمان ہے انکے باہر بھی آسمان ہے۔ اور جب اندر کا آسمان کائناتی آسمان سے باہم ملکر اسمیں مدغم ہوکر ایک ہوجاتا ہے تو وہی ادغام اور تبدیلی آزادی کہلاتی ہے۔ اور یہیں سے خدا کی آگاہی شروع ہوتی ہے۔

چنانچہ میں کسی سے بھی یہ نہیں کہتا کہ خدا کو خود میں بھرلو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تمہیں خود کو خالی کرنا چاہئے پھر تم دیکھو گے کہ خدا تمہارے اندر موجود ہے۔

برسات کے زمانے میں جب بادلوں سے پانی گرتا ہے تو پہاڑیاں تو خشک ہوتی ہیں لیکن کھائیاں اور نشیبی علاقے پانی سے بھر جاتے ہیں۔ تم کھائی اور نشیبی علاقہ بنو، پہاڑیاں نہ بنو۔ خود کو کسی چیز کسی خیال سے نہ بھرو بلکہ خالی رکھو۔ تم پر وجدان (Divice) کی مسلسل بارش ہورہی ہے، صرف خالی پن میں ہی بارش کا پانی سما کر اسے بھرے گا۔ کسی تصویر کی قیمت یہی ہے کہ وہ خالی ہوتی ہے۔ تم جتنا خالی ہوگے، سمندر اتنا ہی اسے بھرے گا۔

ایک شخص جتنا خالی ہو اتنا ہی قابل احترام ہے۔ یہی خالی پن ہے جسے سمندر داخل ہوکر بھردیتا ہے۔

میں جب روحانیت کے خواہشمندوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ تمام لوگ اپنے ذہنوں کو نظم وضبط کا پابند کررہے ہیں۔ لیکن حقیقت کو نظم وضبط سے نہیں پایا جاسکتا۔ اسکے بر خلاف یہ ذہن ہی ہے جو حقیقت کو پہچاننے میں ایک رکاوٹ ہوتا ہے۔ تمہیں تو ذہن کو الگ کرنا چاہئے نہ کہ اسے کنٹرول کرو۔ ذہن کو چھوڑ دو، تمہیں دروازہ ملجائے گا۔ مذہب بھی نہ تو ذہن کے ذریعے حاصل ہوتا ہے نہ ذہن میں ہوتا ہے۔ مذہب کو ذہن سے اختیار نہیں کیا جاتا۔

Ma tzu ایک طلبگار تھا۔ وہ ایک تنہا جھونپڑی میں رہائش پذیر تھا۔ وہ دن ورات اپنے ذہن کو نظم وضبط کا پابند کرنے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے ملنے کے لئے بھی آتا تو وہ اسے نظر انداز کردیا کرتا تھا۔

ایک دن اس کا استاد اسکی جھونپڑی پر آیا۔ Ma tzu نے اسے بھی نظر انداز کردیا لیکن وہ پورے دن وہیں موجود رہا۔ اس دوران وہ اینٹ سے ایک چٹان کو رگڑتا رہا۔ Ma tzu اسے مزید برداشت نہ کرسکا اور پوچھا۔ ''جناب آپ یہ کیا کررہے ہیں؟'' اسکے استاد نے جواب دیا۔ ''میں اس چٹان سے ایک آئینہ بنانا چاہتا ہوں۔''

Ma tzu نے جواباً حیرت سے پوچھا۔ ''اینٹ کے ذریعے آئینہ؟ کیا تم پاگل ہو چکے ہو؟ تم اگر اپنی پوری زندگی اس اینٹ کو رگڑتے رہو تو بھی آئینہ نہیں بن سکتا۔'' یہ سننے کے بعد ماسٹر نے ہنسا شروع کردیا اور Ma tzu سے کہا۔ ''اور تم کیا کررہے ہو؟ اگر ایک اینٹ آئینہ نہیں بن سکتی تو پھر ذہن کیونکر بن سکتا ہے؟''

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ذہن اور نہ ہی اینٹ آئینہ بن سکتی ہے۔ ذہن تو دراصل گرد وغبار ہے جس نے آئینے کو چھپا رکھا ہے۔ اسے چھوڑو، الگ رکھ دو، تب ہی تم حقیقت اور سچائی تک پہنچ سکو گے۔ ذہن خیالات کا ایک ڈھیر ہے، گرد غبار کا آمیزہ، اسے صاف کردو۔ اسکی صفائی کے بعد جو کچھ بچے گا وہ بے داغ شعور ہوگا، ابدیت کا شعور۔ خیالات سے صاف بے ذہنی کی کیفیت میں ہم ابدی حقیقت اور سچائی دیکھیں گے جو خیالات کے دھویں میں چھپی ہوئی ہے۔

جہاں خیالات کا دھواں نہیں ہوگا۔ وہیں پر شفاف شعور ہوگا جسکو حاصل کرنا چاہئے۔ یہ وہی ہے جسے ایک شخص کو ہونا چاہئے۔ تمہاری خواہش اسی طرح پوری ہوگی۔

31

پہلے صبح ہوئی ، اسکے بعد دو پہر آئی اور چلی گئی ۔ اب آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے۔
غروب آفتاب کا انتہائی دلکش منظر۔ مغربی افق پر پھیلا ہوا ہے۔

میں طلوع آفتاب کا منظر روز ہی دیکھتا ہوں ۔ دن ہونا اور گزر جانا۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ہم طلوع ہوئے نہ آگے بڑھ کر دو پہر ہوئے اور نہ غروب۔

کل جب میں ایک سفر سے واپس آیا تو اسکا مشاہدہ کیا سفر سے ہمیشہ ایسی ہی بصیرت ملا کرتی ہے۔ تبدیل ہوتے ہیں لیکن مسافر تبدیل نہیں ہوتا۔ سفر بجائے خود ایک تبدیلی ہے لیکن مسافر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

میں گزشتہ کل کہاں تھا، آج کہاں ہوں؟ میں اُس وقت کیا تھا وہی اب بھی ہوں۔
جسم ویسا ہی نہیں ہے ذہن ویسا نہیں ہے لیکن میں ویسا ہی ہوں۔

مکان و زمان میں تبدیلی ہے لیکن مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں ۔ ہر چیز برق کی طرح بہہ رہی ہے لیکن ایک ''میں'' ہوں کہ اسکا حصہ نہیں۔ ''میں'' کرنٹ تو ہوں لیکن اسکے باہر۔

ازلئی وابدی مسافر، ہمیشہ نیا، ہمیشہ مانوس، کیا ہے، وہ روح ہے۔ تبدیلی ہوتی ہوئی کائنات میں بیدار اور نہ تبدیلی ہونے والی چیز آزاد حالت ہے۔

32

میں تمہیں دیکھتا ہوں اور تمہارے اردگرد پھیلی ہوئی چیزوں کی بھی ۔ بصیرت جو جسم سے رک جاتی ہے۔ وہ نہیں دکھائی دیتی جسم کتنا شفاف ہے، چاہے وہ کتنا ہی ٹھوس کیوں نہ ہو، لیکن وہ اس طرف کی چیزوں کو چھپانے میں قطعی ناکام ہے۔

لیکن اگر دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ ہوں تو ہر چیز تبدیل ہو رہی ہے یہاں تک کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ سورج ہے یا نہیں ہے تمام تر کھیل آنکھوں کا ہے۔ ہم روشنی کا ادراک سوچ اور منطق سے نہیں کر سکتے ۔

روحانی آنکھ کا کوئی متبادل نہیں، یہ انتہائی ضروری ہے۔ روح کو دیکھنے کے لئے ہمیں اندرونی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔، ہمیں اندرونی آنکھ چاہئے ۔ اگر وہ ہوتو ہمیں ہر چیز صاف نظر آتی ہے۔ اسکے بغیر ہم دونوں طرح سے اندھے ہیں چاہے وہ روشنی ہو یا پھر خدا۔

دوسروں کے جسم کے اس پار دیکھنے کے لیے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اپنے جسم کے اجزا کو دیکھیں۔

دوسرے کا جسم اتنا ہی ٹرانسپرنٹ (شفاف) دکھائی دیگا جتنا ہم اپنے اندر کی گہرائی میں دیکھیں گے ۔ ہمیں تمام بے جان دنیا اتنی ہی شعور سے بھری دکھائی دیگی جتنا کہ ہم اپنے شعور کو اجاگر کریں گے ۔ دنیا ویسی ہے جیسا کہ ''میں'' خود ہوں۔ جس دن میں اپنے شعور کو جان لوں گا دنیا اسی دن پوشیدہ ہو جائیگی ۔

خود سے ناآگاہی دینا ہے، خود سے واقفیت حریت اور خود مختاری۔

میں روزانہ لوگوں سے کہتا ہوں ۔ ''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے اندر کون بیٹھا ہوا ہے؟ گوشت پوست کے جسم میں کیا ہے؟ تمہاری ظاہری صورت میں کون قید ہے؟
اس معمولی سے جسم میں کتنی بڑی چیز ہے؟
''شعور کیا ہے؟ شعور کون ہے؟''

اسکی تحقیق کئے بغیر، اسکو جانے بغیر زندگی کا کوئی مفہوم نہیں ۔ یہاں تک کہ ہم سب کچھ جانتے ہوں لیکن خود کو نہ جانتے ہوں، تو بھی تمام تر معلومات کی کوئی اہمیت نہیں۔

جو قوت دوسروں کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہے وہی خود کو بھی سمجھ سکتی ہے۔ آخر ایسا

کیوں نہیں ہوسکتا؟

یہ ایک نیا رخ تبدیل کرنے کے لئے ایک سادہ سا سوال ہے۔ ہم نے جو کچھ دیکھا وہاں چل کر یہ دیکھیں کہ دیکھ کون رہا ہے۔ دیکھنے سے توجہ ہٹا کر دیکھنے والے کو دیکھنا۔ یہی خود اپنے آپ کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ خیالات کے بہاؤ سے نکل کر اسے دیکھنے والے کا ادراک کرنا۔ اس طرح ایک انقلاب رونما ہوتا ہے جیسے یکا یک صاف شفاف پانی کا چشمہ پھوٹ پڑے۔ اور شعور کی برقی روزندگی کی تمام ناآگاہی کو صاف کر دیتی ہے۔

33

گزشتہ شام تک ایک پودا زندہ تھا، اسکی جڑیں زمین کے اندر تھیں اور اسکی پتیوں میں تازگی تھی، وہ سبز اور زندگی سے بھر پور تھیں۔ ہوا سے ہلتے چاروں جانب اسکے سائے پڑتے۔ میں ادھر سے بارہا گزرتے ہوئے اسکی نغمہ سنج زندگی محسوس کر چکا تھا۔

گزشتہ کل کسی نے اسے اکھاڑ پھنکا اور آج جب میں اسکے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ پودا اپنی آخری سانس لے رہا ہے۔ یہی کچھ اس وقت ہوتا ہے جب جڑوں کو زمین سے نکال دیا جائے۔ ہر چیز کا انحصار انکی جڑوں پر ہوتا ہے۔ وہ دکھائی تو نہیں دیتیں لیکن پوری زندگی کا دارومدار انہیں پر ہوتا ہے۔

پودوں اور اشجار کی جڑیں ہوتی ہیں، آدمی کی بھی جڑیں ہوتی ہیں۔ پودوں کے لئے زمین ہے، اور آدمی کی بھی۔ جب جڑوں کو زمین سے نکال دیا جائے تو پودے خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آدمی کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

میں Albert Camus کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کتاب کے ابتدائی جملے یوں تھے۔ ’’فلسفے کے لئے خودکشی ایک معنی خیز مسئلہ ہے۔‘‘ کیوں؟ کیونکہ انسان آجکل اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں پاتا، ہر چیز بے معنی اور فضول ہو کر رہ گئی ہے۔

آخر اسکی وجہ کیا ہے، بس یہی کہ ہماری جڑیں ہل چکی ہیں۔ ہمارا تعلق زندگی کی اہمیت سے ختم ہو چکا ہے جسکے بغیر زندگی ایک بے معنی کہانی ہو کر رہ گئی ہے۔

ہمیں، انسان کو اسکی جڑیں واپس کرنی ہیں۔ ہمیں اسکی زمین واپس کرنی ہے۔ جڑیں کیا ہیں، جڑیں روح ہے۔ زمین مذہب ہے۔ اگر ایسا کر دیا گیا تو انسانیت کا پھول دوبارہ کھل کر لہلہانے لگے گا۔

میں ایک خاندان کے گھر مدعو تھا اور ابھی دھند لکے میں واپس آیا ہوں ۔ اس گھر پر ایک خوشگوار واقعہ پیش آیا۔ وہاں بہت سارے بچوں نے تاش کے پتوں سے ایک گھر بنایا جو مجھے دکھانے کے لئے لے آئے ۔ وہ ایک خوبصورت گھر تھا۔ میں نے اسکی تعریف کی۔ لیکن گھر کی عورت نے کہا۔ "ایک تاش کے پتوں سے بنے گھر میں ایسی کیا چیز ہے جسکی تعریف ہے؟ ہوا کے معمولی سے جھونکے سے اسکی چھت زمین پر آرہے گی۔"

میں نے ہنسنا شروع کردیا تو بچوں نے وجہ پوچھی ۔ ابھی ہم گفتگو کرہی رہے تھے کہ گھر گر گیا۔ بچے افسوس کرنے لگے اور گھر کی عورت نے کہا۔ "تم نے دیکھ لیا۔"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے دیکھا، میں نے دوسرے خوبصورت گھروں کو بھی دیکھا ہے، وہ بھی اسی طرح گرے ہیں۔"

پتھروں کے بڑے محلات تک یہ تو تاش کے پتوں سے بنا ہوا تھا۔ بوڑھے لوگوں نے پتھروں کے محلات تعمیر کئے تھے جیسے کہ بچوں نے تعمیر کیا تھا۔ ہم سب لوگ محلات تعمیر کرتے ہیں ۔خوبصورت اور عظیم محلات ۔اور انہیں معمولی سی ہوا زمین بوس کر دیتی ہے۔ ان معنوں میں ہم سب بچے ہیں ۔ پختگی کم کم نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگ تو مرتے دم تک بچے ہی رہتے ہیں۔

تمام مکانات ، کارڈ کے بنے ہوئے مکانات ہی ہوتے ہیں۔ اسکو سمجھنے کی کوشش کرنے والوں میں پختگی آجاتی ہے۔ اسکے باوجود بھی وہ تعمیرات میں لگے رہتے ہیں۔ اس وقت تک وہ اداکاری ہوتی ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے یہ صرف اداکاری ہے، جب تک کہ دنیا سے آزاد نہ ہوجائیں۔

صرف وہ معمولی سی ہوا سے مسمار نہیں ہوتے جسے ہم سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔

گزشتہ شب بارش ہوئی تھی ۔ موسم بھیگا ہوا ہے اور اس وقت پھر بوندا باندی شروع ہوچکی ہے۔ بھیگی ہوائیں دروازے پر پڑی ہوئی پتیوں کو اڑا رہی ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے موسم خزاں آچکا تاکہ موسم بہار کی تیاری کر سکے ۔ راستے سوکھی ہوئی پتیوں سے بھرے پڑے تھے اور لوگوں کے پیروں تلے دب کر خوشگوار آوازیں پیدا کررہے تھے ۔

میں ان پتیوں کو بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا جو اپنی مدت حیات پوری کر کے گری ہوئی تھیں ۔ پتیاں صبح سے شام تک مسلسل گرتی رہی ہیں لیکن اسکی وجہ سے درختوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ۔

اس سے زندگی کا عجیب وغریب روپ سامنے آتا ہے لیکن تیار (پکے) پھل خود بخود گر جاتے ہیں۔

ایک سنیاسی آیا۔ پرہیز گاریوں نے اسے ابتک کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ وہ تکلیف دہ اور مشکل ہے۔ اس نے قدرتی انداز میں سنیاس نہیں لیا ہے۔ اس نے اسکے لئے دقت اٹھائی ۔ محبت ، ناآگاہی ، ملکیت اور انا کی پتیاں ابھی تک کچی تھیں۔ اس نے زبردستی گرائیں چنانچہ پتیاں تو گریں لیکن وہ تکلیف کا باعث بنیں ۔ یہ تکلیف آتے ہوئے راحت کو غارت کردیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج شام جا کر مجھے ان پتیوں کے گرنے کی وجہ بیان کردینی چاہئے ۔ پہلے سمجھنا چاہئے تاکہ پرہیز گاری شروع کردی جائے ۔ اگر سمجھ بوجھ کر سنیاس لیا جائے تو دینا سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح گر جاتی ہے۔ سیناس طاقت سے نہیں بلکہ خود بخود حاصل ہوتا ہے۔

انقلابی سمجھ کے بعد پرہیز گاری لطف انگیز ہوتی ہے تکلیف دہ نہیں۔

36

علم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ علم کی ایک قسم تو وہ ہے جس کے ذریعے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذہانت کی سمجھ بوجھ۔ ایک علم وہ ہوتا ہے تجربات جو ذہانت اور زندگی کے مشاہدات سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک علم کا محاصل مردہ حقائق ہوتے ہیں جبکہ دوسرے سے زندگی کی سچائیاں آشکار ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، زمین وآسمان کا فرق، اندھیرے اور اجالے کا فرق۔

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی (انٹیلکچوول) علم سرے سے علم ہی نہیں ہوتا۔ یہ علم کا فریب ہوتا ہے۔ کیا ایک اندھا آدمی روشنی کو سمجھ سکتا ہے؟ یہ ذہنی علم ہے۔

یہ علم کا فریب جہالت کو چھپا دیتا ہے۔ یہ صرف اصلیت کو پوشیدہ کردیتا ہے۔ الفاظ کی بھول بھلیوں یا ہیر پھیر اور خیالات پر دھویں کا پردہ، جہالت کو چھپا دیتا ہے۔ حالانکہ جہالت کا چھپنا اور زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ جہاں جہالت نظر آرہی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس سے نکلا جائے جس میں جہالت چھپی ہوئی ہو تو وہ شخص اس سے باہر نہیں نکل پاتا، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

نام نہاد عقلمند لوگ اپنی جہالت کے باعث تباہ ہوجاتے ہیں۔

علم۔ صحیح علم۔ کہیں باہر سے نہیں حاصل ہوتا۔ ہوشیار رہو کہ باہر سے آنے والا علم، علم نہیں ہوتا۔ یہ صرف معلومات ہوتی ہیں۔ خیال رکھو ایسے علم کے فریب میں مت آؤ کیونکہ باہر سے جو کچھ آرہا ہے وہ تم پر ایک اضافی تہہ جما دیتا ہے۔

علم خود اندر سے پھوٹتا یا جاگتا ہے۔ یہ کہیں باہر سے نہیں آتا اسکے لئے ہمیں جگہ بنانی ہے، خود پر مزید تہہ نہیں جمائی جاتی۔

علم حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اسے Discover کیا جاتا ہے۔ حاصل کردہ (Acquired) علم معلومات ہیں۔ تلاش کیا ہوا علم تجربات ہیں۔ زندگی پر دباؤ ہوتا ہے کہ حاصل کردہ علم کو ایک شکل میں فٹ کیا جائے لیکن وہ ہر طرح درست نہیں ہوتا چنانچہ ان معلومات (علم) اور زندگی کے درمیان ایک تنازعہ شروع ہوجاتا ہے۔

لیکن ہمارا طریقہ عمل قدرتی طور پر تلاش کردہ (Discovered) علم کے مطابق ہوتا ہے، یہ ممکن نہیں ہوتا کہ حقیقی علم کو رد کیا جاسکے۔ اس دنیا میں آج تک ایسا کبھی نہیں

ہوا۔

مجھے ایک کہانی یاد آرہی ہے، دو انتہائی جہاں دیدہ اشخاص ایک ساتھ سفر کررہے تھے۔ وہ ایک گھنے جنگل کے خطرناک راستے سے گزرے۔ وہ دونوں باپ اور بیٹا تھے۔ لڑکا آگے تھا جبکہ باپ پیچھے۔ راستہ ویران اور خوفناک تھا۔ یکایک انہیں ایک شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ باپ نے بیٹے سے کہا۔ ”میرے پیچھے آجاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔“ لڑکا ہنسا اور بدستور آگے آگے چلتا رہا۔ باپ نے دوبارہ تنبیہ کی۔ اتنے میں شیر سامنے آگیا۔ موت یقینی ہوگئی۔ لڑکے۔ شیر سے دور رہو۔ ”لیکن لڑکا ہنستے ہوئے، اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔

اتنی دیر میں شیر اس تک پہنچ گیا، وہ گر گیا، لیکن اس نے دیکھا جو شخص گرا تھا وہ ”میں“ نہیں تھا۔ وہ جسم نہیں تھا اس لئے وہ مر نہیں سکتا تھا۔ اب اسکی سمجھ میں آیا کہ اس کا باپ کیا کہتا تھا۔ فرق واضح تھا۔ اسکا باپ ملال کا شکار رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ لیکن بیٹا گواہ تھا، زندگی میں اور موت میں۔ اسے کوئی دکھ کوئی اور تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ بے حرکت پڑا رہا کیونکہ جو کچھ بھی اس کے جسم کے ساتھ ہو رہا تھا وہ باہر سے ہو رہا تھا۔ وہ خود اس سے کسی طرح متاثر نہیں ہوا تھا۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ معلومات اور علم میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔

گیان، دھیان یا مراقبہ کیا ہے؟

کسی نے کہا۔ ''قطرے کا سمندر میں ملنا۔''

کسی دوسرے نے کہا۔ ''سمندر کا قطرے کی طرف بڑھنا۔''

لیکن میں کہتا ہوں۔ ''یہ دونوں یعنی قطرے اور سمندر کا باہم ملکر غائب ہو جانا ہے۔ جہاں نہ تو قطرہ رہ جاتا ہے اور نہ سمندر گیان دھیان وہیں ہے۔ جہاں نہ تو ایک ہوتا ہے اور نہ دوسرا وہی سمادھی (گیان دھیان) ہے۔ جہاں نہ محدود ہو اور نہ لامحدود وہی سمادھی ہے۔''

سمادھی وجود کی وحدت اور یکتائی ہے۔

سمادھی حقیقت اور سچائی ہے۔ سمادھی شعور ہے۔ سمادھی سکون اور سکوت ہے۔

سمادھی میں ''میں'' نہیں رہتا بلکہ جب میں اپنے وجود کی نفی کر دیتا ہوں تو جو کچھ بچتا ہے وہ سمادھی ہوتی ہے۔

اور شاید یہ ''میں'' جو دراصل ''میں'' نہیں وہ حقیقی ''میں'' ہوں۔

(and perhaps this 'i' which is not 'i' is the real 'i')

''میں'' میں دو وجود ہوتے ہیں۔ ایک ''خودی، انا'' اور دوسرا برہما اور حقیقت اعلیٰ۔
میں انا اور خودی نہیں ہوں لیکن لگتا ہوں۔ میں برہما اور حقیقت اعلیٰ ہوں لیکن لگتا نہیں ہوں۔

شعور احساس، خالص شعور واحساس برہما ہے۔

میں شعور کا شاہد ہوں لیکن چونکہ میں اسے خیالات کے دھارے میں شناخت کرتا ہوں اس لئے نہیں دیکھ پاتا۔ خو۔ خیالات شعور نہیں ہوا کرتے۔ شعور خیالات کو گرفت کرتا ہے۔ شعور خیالات کا شاہد ہوتا ہے۔ خیالات مادی ہوتے ہیں جنہیں محسوس کیا جا سکتا ہے جبکہ شعور (Subject) موضوع ہے۔ subject کی شناخت object سے کرنے کے لئے بے شعور ہونا ہوتا ہے۔ یہ سمادھی کی ضد ہے۔ یہ نیند ہے۔

خیالات نہ ہوں تو شعور ہوتا ہے۔ اس سے جو کچھ بچتا ہے وہ سمادھی ہے۔

خیالات کی عدم موجودگی وجود کا دروازہ کھولتی ہے۔ وجود کا مطلب یہ ہے کہ جو ہے۔ اسی میں بیدار ہونا۔ توہمات اور تعصبات سے آزاد لوگوں کی طرف سے یہی پیغام ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مالی بیج بو رہا ہے۔ اس کے بعد وہ زمین میں کھاد ڈالتا ہے، پانی دیتا ہے اور پھولوں کے کھلنے کا انتظار کرتا ہے پھولوں کو زبردستی نہیں کھلایا جا سکتا بلکہ تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

روحانیت کا بیج بھی اسی طرح بونا چاہئے۔ پھر اسی طرح روحانیت کے پھولوں کا انتظار بھی تحمل سے کیا جانا چاہئے۔

دعا اور تحمل۔

زور زبردستی اور غیر متحمل ہونا کہیں کا بھی نہیں چھوڑتا۔ غیر متحمل ہونے سے بڑھوتری پروان نہیں چڑھتی۔

اگر اطمینان، تحمل اور محبت سے کوئی شخص انتظار کرتا ہے تو ایک خوشگوار صبح اسے پھول کھلے ہوئے ملتے ہیں اور اسکی خوشبو سے اسکی زندگی کا صحن مہک اٹھتا ہے۔

لاتعداد پھولوں کے لئے اتنے ہی تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھو اگر تم بے انتہا تحمل کے لئے تیار ہو تو تمہاری بیداری بھی بلاتاخیر ہونی چاہئے۔

بہت پانے کے لئے واحد شرط بہت تحمل ہے۔ جس لمحے یہ شرط پوری ہوگی گوہر مقصود ملجائے گا۔ یہ باہر سے نہیں آتا۔ یہ اپنے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو پہلے ہی موجود ہے لیکن عجلت اور بیتابی کی وجہ سے ہم اسے نہیں دیکھ پاتے۔

39

انسان کا ذہن عجیب وغریب چیز ہے۔اسمیں دنیا بھر کی باتیں اور راز بھرے ہوتے ہیں۔گناہ، اچھائیاں، محکومی، جہنم، جنت اور بہت کچھ، اندھیرا اور اجالا، اسکا خود پیدا کردہ ہے۔اس کی پیدائش اور موت بھی اسی میں ہے۔ یہ اکیلا دروازہ بھی ہے تاکہ باہر کی دنیا تک پہنچ سکے۔اس اکیلے میں اندرونی ہستی کے لئے سیڑھی بھی ہے۔ یہ جب اپنا وجود کھوتا ہے تو ہم دونوں جہاں سے نکل جاتے ہیں۔دماغ یا ذہن سب کچھ ہے۔ ہر چیز اسکی تصوراتی پیداوار ہے۔اگر یہ نہ رہے تو سارے تصورات ختم ہوجائیں۔

گزشتہ کل میں نے یہ بات کہیں کہی۔ایک شخص پوچھنے کے لئے آگے بڑھا۔ ''ذہن بڑا غیر مستحکم اور متلون مزاج ہے۔اس سے کس طرح چھٹکارا پایا جائے؟ ذہن بڑی خراب چیز ہے۔اسے پاک وصاف کس طرح بنایا جائے؟'' پھر میں نے ایک کہانی سنائی۔

بدھا کے کہن عمری میں پہنچنے کے بعد، ایک دوپہر وہ ایک درخت کے نیچے آرام کی غرض سے رکا۔ یہ ایک جنگل تھا۔اسے پیاس محسوس ہوئی تو آنندہ (Ananda) ایک پہاڑی چشمے کے دھارے پر پانی لینے کی غرض سے گیا۔لیکن اس سے قبل پانی کے دھارے سے چند گاڑیاں گزر گئیں جسکی وجہ سے پانی گدلا ہوگیا۔

سوکھی پتیاں اور گھاس وغیرہ پانی کی سطح پر آگئیں۔آنندہ پانی لئے بغیر واپس آگیا اور بدھا سے کہا۔ ''چشمے کا دھارا دور تھا چنانچہ بدھا نے کہا کہ چشمے کے دھارے سے ہی پانی لے آؤ۔تھوڑی دیر بعد آنندہ دوبارہ خالی ہاتھ واپس آگیا اسے پانی صحیح نہیں لگا کہ وہ لے آتا۔

لیکن بدھا نے اسے ایک بار پھر بھیجا۔تیسری بار آنندہ چشمے سے نکلنے والے دھارے کے قریب پہنچا۔اسے سخت حیرت ہوئی کیونکہ اس بار دھارے کا پانی قطعی صاف اور نتھرا ہوا تھا۔گدلا پن ختم ہو چکا تھا اور پانی بالکل صاف تھا۔

مجھے یہ کہانی بڑی اچھی لگی۔انسانی جسم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔زندگی کا ٹریفک آتا ہے اور لہریں پیدا کر کے آلودہ کردیتا ہے۔لیکن اگر کوئی تحمل سے بیٹھ کر مشاہدہ کرے تو دیکھے گا کہ آلودگی نیچے بیٹھ کر قدرتی صفائی میں تبدیل ہوجائیگی۔ذہن کی اس صفائی میں زندگی کی تجدید بھی ہوجاتی ہے۔ یہ صرف تحمل اور خاموشی سے انتظار کا معاملہ ہوتا ہے اور بلا کئے

کرائے ذہن کی آلودگی صاف ہوجاتی ہے۔

ایک شخص کو صرف مشاہدہ کرنا ہوتا ہے اور ذہن صاف ستھرا ہوجاتا ہے۔ صفائی کرنے میں ہماری کسی پیش رفت کی ضرورت نہیں ہوتی۔مشکلات آنے کا سبب کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہے کہ ہم کسی نہ کسی توڑ میں پڑ جاتے ہیں۔صرف اسے مشاہدہ کرتے رہیں، جیسے ساحل پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔پھر دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

40

رات کی تنہائی میں کوئی شخص بانسری بجارہا ہے۔ لگتا ہے چاند کی روشنی سردی سے جم چکی ہے۔ اس رات کے سناٹے اور یخ بستگی میں بانسری کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی خوشگوار خواب سی لگ رہی ہے۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین حد تک دل پزیر ہے۔ کھوکھلے بانس کی چھڑی میں کتنی مدھرتا بھری ہوئی ہے۔

زندگی بھی بانسری جیسی ہی ہے۔ خالی اور بیکار لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوش نوائی اور غنائیت کے لئے بہت بڑی جگہ بھی ہوتی ہے۔

لیکن سب کچھ اسے بجانے والے پر ہوتا ہے۔ زندگی وہی ہو جاتی ہے جیسا اسے بنایا جاتا ہے۔ یہ خود اس شخص پر ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک موقع ہوتا ہے۔ ایک شخص خود فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کس قسم کا نغمہ سننا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ نغمۂ بہشت سماعت کرنا چاہتا ہے یا جہنم کی الاپ۔

ہر شخص اپنی بانسری پر روحانی لے پیدا کرسکتا ہے۔ صرف انگلیوں کو تھوڑی سی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشق تو تھوڑی لیکن اسکا عوض بہت بڑا۔ لامحدود اختیارات کے مالک کی عنایات بلا کچھ کئے سمیٹی جاسکتی ہیں۔

میری خواہش ہے کہ میں سارے دلوں سے کہوں۔ ''اپنی بانسری اٹھاؤ۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ خیال رکھو نغمہ گانے کا موقع کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ پردہ گرنے سے پہلے تمہیں اپنی زندگی کا خوشگوار نغمہ الاپنا ہے۔

41

اس بات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ روحانی راستے میں پھل کیا ہوتا ہے اور بیج کیا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ابتدا اور انتہا کو پہچانا جائے۔ وہ لوگ جو سمجھے بوجھے بغیر آگے بڑھتے ہیں وہ غلطی کرسکتے ہیں۔ بلا تیاری چلے جانا مناسب نہیں۔ نادانی کے ساتھ چلنے سے کسی کو منزل نہیں ملتی۔ راستے کا صحیح تعین اور روحانیت کے لئے کوشش صحیح صحیح ہونی چاہئے۔

روحانیت کے راستے کے لئے ایک چیز مرکزی ہوتی ہے اسکے علاوہ بہت سی چیزیں اضافی اور کم اہمیت کی ہوتی ہیں۔ اگر اپنی کوششوں کی ابتدا مرکز سے کی جائے تو اضافی چیزیں خود بخود ہٹ جاتی ہیں۔ ان پر بطور خاص توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صرف مرکز ہوتا ہے جس پر توجہ دی جاتی ہے چنانچہ کوششیں اپنے دائرے میں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

مرکز کیا ہے، اور اضافی یا کم اہمیت کی چیزیں کیا ہیں؟

آگاہی مرکز ہے اور عاجزی وانکسار اضافی چیز۔ ابتدا آگاہی سے ہوتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والی چیز عاجزی اور انکسار ہے۔ آگاہی بیج ہے جبکہ عاجزی اور انکسار پھل۔ لیکن عام طور پر لوگ مخالف سمت سے ابتدا کرتے ہیں۔ وہ عاجزی سے شروعات کر کے علم تک پہنچنا چاہئے ہیں۔ وہ انکسار کو علم میں تبدیل کرنا چاہئے ہیں۔

لیکن عاجزی کی فصل جہالت میں نہیں اگائی جاسکتی بلکہ حقیقت یہ ہے عاجزی ہوتی ہی نہیں۔ عام عادت والی عاجزی فریب ہوتی ہے۔ اندھیرے اور تاریکی کو روکا اور چھپایا نہیں جاسکتا۔ اسے نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ عاجزی کے کاغذی پھولوں کو محرومی کے ڈبے پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ اسے نابود کرنا ہوتا ہے۔ اسکی غیر موجودگی میں جو کچھ برآمد ہوگا وہ عاجزی ہوگی۔

جہالت سے عاجزی پیدا کرنا خطرناک ہے کیونکہ اس میں جو دکھائی نہیں دیتا اور جو کچھ لانا چاہتے ہیں وہ ختم ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

جہالت میں کوئی ایسا راستہ نہیں ہوتا کہ براہ راست عاجزی کو اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اسکے اندر آشکار جہالت کی غیر موجودگی ہوتی ہے۔ عاجزی کی کی جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ بدھا نے کہا ہے۔'' جاہل شخص بیچارا کیا کرسکتا ہے؟''

یہ انکسار نہیں آگاہی ہے جسے حاصل کرنا چاہئے آگاہی تو خود عاجزی بنجاتی ہے۔

آگاہی ہر چیز کو روشن وتاباں کردیتی ہے۔ جب یہ آتی ہے تو جہالت اور مغالطہ یا واہمہ خود بخود درفع ہوجاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے عارضی فریفتگی اور نفرت جلا پا وغیرہ بھی معدوم ہوجاتا ہے۔ آگاہی وہ چیز ہے جس سے آزاد کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

42

آج صبح مجھے ایک خط موصول ہوا۔ کسی نے پوچھا ہے۔ ''زندگی تکلیف اور مصائب سے پُر ہوتی ہے پھر بھی تم مسلسل امرت اور روحانی سکون کی باتیں کرتے رہتے ہو؟ جو صورت احوال ہے اگر اسے دیکھا جائے تو روحانی سکون اور مسرت کی باتیں خیالی صورت گری لگتی ہیں۔''

یقیناً ہم سب دکھ اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

زندگی اس سے بھری ہوئی ہے لیکن ہم جس میں گھرے ہوئے ہیں وہ دکھ اور پریشانیاں نہیں ہیں۔ ہم اپنے اردگرد جتنی نظر ڈالیں تو لگے گا وہاں دکھ اور پریشانیاں ہیں لیکن اس لمحے جب ہم اپنے اردگرد دیکھنے کی ابتدا کریں گے تو دکھ پریشانیاں غیر حقیقی ہوجائیں گی اور سکون ومسرت حقیقی بن کر نظر آنے لگے گی۔

یہ سب کچھ تناظر کا مسئلہ ہے۔ ہمارا دیکھنا جس سے صاحب بصیرت دکھائی دے بس وہی دیکھنا ہوتا ہے۔ دیگر چیزیں ناہنجگی ہے۔ وہ لمحہ جب صاحب بصیرت دکھائی دیتا ہے تو ہر چیز تبدیل ہوکر روحانی سکون اور مسرت بنجاتی ہے کیونکہ سکون اور خوشی قدرتی حقیقت ہے۔ دنیا اُس وقت بھی رہتی ہے لیکن تبدیل ہوکر مختلف ہوجاتی ہے۔ ہماری جہالت کی وجہ سے جو کانٹے نظر آتے ہیں وہ کانٹے نہیں رہ جاتے۔

دکھ پریشانیاں حقیقی نہیں ہوتیں کیونکہ بعد میں تجربات سے اسے رفع کیا جاسکتا ہے۔ ویسے ہی جیسے جاگنے کے بعد خواب غیر حقیقی ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح اگر تم خود کو اچھی طرح سمجھ لو تو دکھ اور پریشاں غیر حقیقی ہوجائیں گی۔

خوشی ومسرت حقیقت ہے کیونکہ یہ اپنی ذات ہے۔

43

گزشتہ کل میں نے ایک جگہ گفتگو کی۔

میں نے کہا۔ ''میں تمہیں غیر مطمئن بنانا چاہتا ہوں کہ روحانی پیاس اور روحانی بے اطمینانی ہر ایک شخص میں پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ میری خواہش ہے۔ انسان موت سے ہی مطمئن ہوسکتا ہے۔ انسان انقلاب کا آخری سرانہیں ہوتا۔ وہ انقلابی سیڑھی کا صرف ایک قدم ہے۔ اس میں جو کچھ ظاہر ہے وہ چھپی ہوئی چیز کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں یہ مقابلہ اس بات کے کہ وہ کیا ہوسکتا ہے۔

مذہب ہر شخص کو آسودہ خاطری کی موت سے ناآسودہ زندگی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔
کیونکہ صرف یہی طریقہ ہے کہ ناآسودگی کے ذریعے حقیقی آسودگی تک پہنچا جائے۔

انسان کو چاہئے کہ انسانیت افضل کرے۔

یہی برتری اسے روحانیت تک لیجاتی ہے۔

یہ برتری کیسے آتی ہے؟

پہلے اسکی تعریف کو سمجھ لو پھر برتری کا طریقہ عمل سمجھ میں آجائے گا۔

حیوانیت: سوچنے کی کیفیت سے پہلے۔

انسانیت: سوچ کی کیفیت۔

شان خداوندی: سوچ سے ماورا کیفیت یعنی فہم سے باہر۔

اگر ہم سوچ کی حدود سے باہر نکلیں تو شعور شان خداوندی تک پہنچ سکتا ہے۔
خیالات کو افضل و فائق کرنا، انسانیت کو افضل کرنا ہوتا ہے۔

44

میں قدرتی مناظر میں خدا کا دیدار کرتا ہوں۔ میں ہر لمحے ہر منٹ اُسے محسوس کرتا ہوں۔ کوئی واحد سانس بھی اس سے ملے بغیر نہیں آتی۔ جہاں بھی میری نگاہیں پڑتی ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ وہ موجود ہے۔ میرے کان میں جتنی آوازیں آتی ہیں وہ سب اسی کے نغمات ہوتے ہیں۔

وہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہ صرف ہماری بصیرت کا معاملہ ہے۔ وہ تو موجود ہے لیکن ہمیں وہ آنکھیں درکار ہیں جس سے ہم اسے دیکھ سکیں۔ اگر آنکھیں تیار ہوں تو ہر جگہ اسکا جلوہ موجود ہے۔

شب کی تاریکی میں جب آسمان ستاروں سے بھرا ہو تو سوچو نہیں بلکہ اسے دیکھو، مشاہدہ کرو۔ اور جب وسیع سمندر میں بڑی بڑی لہریں۔ اٹھ رہی ہوں تو اس کے متعلق کچھ نہ سوچو اسے دیکھو۔ اور جب ایک کونپل شگوفہ بننے کی ابتدا کرے تو اسے دیکھو، صرف مشاہدہ کرو۔ جب ذہن میں کوئی خیال نہیں ہوگا، اور تم دیکھ رہے ہوگے تو وہ عظیم راز آشکار ہوجائے گا اور تم قدرتی مناظر کے دروازے سے رموز معرفت اور خدا کو پالو گے۔

مظاہر فطرت کچھ اور نہیں بلکہ ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے خدا موجود ہوتا ہے۔
اور صرف وہی زندگی کے حقائق سے واقف ہوسکتا ہے جو اس پردے کو ہٹانا جانتا ہو۔

حقیقت کو جاننے کا خواہشمند ایک جوان گرو کے پاس پہنچا۔ پہنچتے ہی اس نے پوچھا۔ ''میں حقیقت اور سچائی کو جاننا چاہتا ہوں۔ میں مذہب کو بھی سمجھنا چاہتا ہوں۔ برائے مہربانی راہنمائی کریں کہ میں کہاں سے ابتدا کروں؟''

گرو نے کہا۔ ''کیا تم قریب کے پہاڑ سے گرتے ہوئے آبشار کی آواز سن رہے ہو؟''

جوان شخص نے جواب دیا: ''میں اسے صاف طور پر سن رہا ہوں۔''

گرو نے کہا۔ ''پھر یہیں سے ابتدا کرو، یہیں سے داخل ہوجاؤ۔ یہیں تو دروازہ ہے۔''

سچ ہے کہ داخلے کا دروازہ انتہائی قریب ہے۔ آبشار جو پہاڑوں سے گر رہا ہے، درختوں کی پتیاں جو ہوا سے ہل رہی ہیں، سوچ کی کرنیں جو انتہائی وسیع سمندر پر چمک رہی

ہیں ، رقص کر رہی ہیں ۔ لیکن ان پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے جو اس وقت تک نہیں اٹھتا جب تک کہ ہم خود اسے نہ اٹھائیں ۔

جو سچ پوچھو تو پردہ دروازے پر نہیں بلکہ ہماری بصیرت پر پڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ لامحدود دروازوں کو ایک پردے نے چھپا رکھا ہے۔

45

چاند اوپر آ رہا ہے۔ درختوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی اسکی روشنی راستے پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہواؤں میں آم کے بور کی خوشبو رچی سی ہے۔

میں ابھی ابھی ایک سمپوزیم سے واپس آیا ہوں ۔ وہاں پر حاضرین کی زیادہ تر تعداد جوانوں پر مشتمل تھی جو جدید دور کے تقاضوں اور دلچسپیوں سے معمور تھے ۔ یہ ایسا ہے جیسے انکا اعتماد و یقین پر کوئی یقین نہ ہو، انکار و بطلان انکا شیوہ ہو۔ انمیں سے ایک نے کہا۔ ''میں خدا کو نہیں مانتا، میں بالکل آزاد اور خود مختار ہوں۔''

یہ بیان صرف آجکل کے موڈ اور وقت کی عکاسی کرتا ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں ۔ یہ پورا دور آزاد روی کے سائے میں ہے، انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ آزادی خودکشی جیسی ہے۔

یہ خودکشی جیسی کیوں ہے۔؟ کیونکہ خود اپنے سے انکار کے بغیر خدا سے انکار ناممکن ہے۔

میں نے انہیں ایک کہانی سنائی ۔

خدا کے محل کے باغ میں انگور کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے تھک چکی تھی ، اطاعت اور اطاعت ۔ وہ محکومی سے بیزار ہو چکی تھی چنانچہ ایک دن اس میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ آزاد ہو جائے ۔ اس نے اپنی پوری قوت سے آواز لگائی کہ پورا آسمان اس آواز کو سن لے ۔ ''اب میں نہیں پھیلوں گی ، نہیں بڑھونگی ، نہیں پھیلوں گی۔''

یہ بغاوت حیرت انگیز تھی کیونکہ انگوری بیل کی بات حقیقی فطرت کے خلاف تھی۔

خدا نے دیکھا اور فرمایا۔ ''مت پھیلو۔ پھیلنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

انگور کی بیل بڑی خوش تھی ۔ بغاوت کامیاب رہی تھی۔ اب وہ نہ پھیلنے کی کوشش کرنے لگی ۔لیکن بڑھوتری نہیں رکی ۔ کبھی نہیں رکی وہ کوشش کرتی کہ نہ بڑھے ، لیکن اسکا بڑھنا جاری رہا۔ اور خدا کو تو یہ بات پہلے ہی معلوم تھی۔

یہی صورت حال ہے۔ خدا ہماری حقیقی فطرت ہے۔ یہ ہمارے اندر کا قانون ہے۔ اس قانون سے کوئی انحراف نہیں کرسکتا ۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ ہم اسے تسلیم نہ کریں ۔ بہرحال ہم جتنا چاہیں انکار کریں ، ہم کتنی ہی آزادی چاہیں ۔ اس سے آزاد ہونا ممکن نہیں کیونکہ یہ تو ہماری ذات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی ہے، ہم تو تصوراتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے جو میں کہتا ہوں آزادی اس سے نہیں بلکہ اسکے اندر ہے۔

46

ایک بادشاہ نے ایک ایسے شخص کو زنداں میں ڈال دیا جسکی صحت اچھی اور ذہن متوازن تھا۔

وہ انسان کی تنہائی اوراس کے اثرات کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔قیدی کچھ دیر تک چیختا چلاتا اور روتا رہا۔ وہ باہر نکلنے کی مایوسی میں اپنا سر بھی پیٹتا رہا۔ اسکی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اسکی پوری زندگی دوسروں کے سپرد تھی۔ اسکی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے لئے تنہائی ایسی تھی جیسے اسکا وجود ختم ہوگیا ہو۔

اس میں ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی ۔ اسکے اندر کی کوئی چیز غائب ہونے لگی اور خاموشی اسپر چھا کر رہ گئی ۔ چیخنا چلانا ختم ہوگیا۔ آنسو خشک ہوگئے ۔ اسکی آنکھیں پتھرا گئیں ۔ وہ کچھ دیکھتا تھا تو بھی نہیں دیکھتا تھا۔

دن گزرے، مہینے گزرے اور بالآخر سال بیت گیا۔ اسکی خوشیوں اور آرام کے لئے تمام انتظامات کئے گئے تھے۔ اسے قید میں وہ تمام چیزیں حاصل تھیں جو باہر آزادی میں بھی حاصل نہیں تھیں ۔ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ بادشاہ کی مہمان نوازی تھی۔

لیکن سال کے اختتام پر ماہر معالجین نے اعلان کردیا کہ قیدی شخص پاگل ہوگیا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں وہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک برس پہلے تھا۔ شاید اس سے بھی زیادہ صحت مند۔ لیکن اندرونی طور پر؟ اندرونی طور پر وہ ایک طرح سے مرچکا تھا۔

میں پوچھتا ہوں ۔ کیا تنہائی کسی شخص کو پاگل بنا دیتی ہے؟ تنہائی ایک آدمی کو پاگل کیسے کرسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہاں پاگل پن پہلے ہی موجود تھا۔ باہر کے تعلقات نے اس پاگل پن کو چھپا رکھا تھا۔ تنہائی نے اسے صرف بے نقاب کردیا۔ انسان کی بے کلی کہ وہ لوگوں سے دور ہے اور انہیں نہیں دیکھ سکتا۔

اسی لئے لوگ خود سے فرار حاصل کررہے ہیں۔ لیکن اس فرار کو صحت مند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ حقیقت نہ دکھائی دے تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ تم اس سے آزاد ہو۔ وہ شخص جو ذہن اور جسمانی طور پر صحت مند ہو شدید تنہائی میں بھی بھٹکانے والی شے ہے۔ کبھی کبھی یہ خود فریبی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ ایک شخص کو یہ بات معلوم ہوگی کہ اس کے اندر کون سی عریانی ہے۔ اگر یہ غیرارادی طور پر یکایک ہوتی ہے تو شخصیت بکھر کر پاگل پن میں بدل جاتی

ہے۔ اور رکی ہوئی چیز جلد یا بدیر ایک دھماکہ بنجاتی ہے۔

مذہب ایک ایسی سائنس ہے جو ایک شخص کو اپنی ہی تنہائی میں لیجاتی ہے۔ پردوں کے ہٹتے ہی ایک حیرت انگیز حقیقت سے مڈبھیڑ ہوجاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہم واقعی تنہا ہیں ۔ گہرائی میں پہنچ کر انتہائی اندر کے مرکز میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک شخص تنہا ہے۔ لیکن چونکہ ہم تنہائی سے مانوس نہیں ہیں اس لئے ہمیں خوف محسوس ہوتا ہے۔

جہالت اور نا مانوسیت کی وجہ خوف ہوتی ہے۔ اگر ایک بار مانوس ہو جائیں تو خوف، بے خوفی اور خوشیوں میں تبدیل ہوجائیگا ۔ تنہائی کے ماحول میں ، حقیقت ، شعور، خوشیاں۔ سب ہی کچھ موجود ہوتی ہیں۔ اپنے اندر اترنے سے ہی خدا ملتا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تنہائی سے فرار نہ حاصل کرو بلکہ اپنے اندر غوطہ لگاؤ۔ سمندر میں غوطہ لگانے سے ہی موتی ہاتھ آتے ہیں۔

47

رات میں بارش ہوئی تھی۔ سڑکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ ہوا میں نمی ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے سورج نہیں نکلے گا۔ صبح میں تاریکی محسوس ہورہی ہے۔

ایک جوان آدمی آیا ہے۔ وہ بہت پڑھا لکھا لگ رہا ہے۔ اس کی آواز سے کتابوں کے علاوہ کوئی خوشبو نہیں آرہی ہے۔ یہ خوشبو کیسے آئی۔

میں اسکی باتیں سنتا رہا حالانکہ وہ میری باتیں سننے کے لئے آیا ہے۔ وہ ایک گھنٹے تک باتیں کرتا رہا لیکن اس نے جتنی باتیں کیں وہ اسکی اپنی نہیں تھیں۔ اسکا ذہن مشینی ساتھا جیسا کہ آجکل ہمارے تعلیمی نظام میں رائج ہے اور وہ ایسے ہی ذہن پیدا کررہے ہیں، تخلیقی نہیں۔ وہ یادداشت کی تعلیم ہے، فکر اور سوچ کی نہیں۔ خیالات تو جمع ہوگئے ہیں لیکن سوچنے سمجھنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی۔ یہ خطرناک صورت حال ہے۔ اس کے ذریعے سوچنے کی اہلیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تاکہ وہ خود تجربات کرسکے۔ طلبا صرف دوسروں کے الفاظ مشین کی طرح دہراتے رہے ہیں۔

یہ یادداشت کی جگہ تو بھر دیتے ہیں لیکن یہ حقیقی تعلیم نہیں ہے۔ اس قسم کی تعلیم صرف تعلیم کا دکھاوا ہے۔ تعلیم کو اندرونی بصیرت بڑھانے کا ذریعہ بننا چاہئے تاکہ ان میں خود اپنے مسائل دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوسکے۔ مسائل میرے ہیں۔ دوسرے لوگ کیونکر اسکا حل پیش کرسکتے ہیں؟ اور ہر مسئلہ نیا مسئلہ ہوتا ہے پھر پرانا حل کیسے کارگر ہوگا۔

ہماری پنہاں قوت تخلیقی صلاحیت کو تعلیم کے ذریعے بیدار کرنا چاہئے۔ ہمیں انہی خیالات سے چمٹے نہیں رہنا چاہئے جن میں نہ ہم رہے ہیں اور نہ ہم جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ قطعی مرچکے ہیں اور اب صرف ہمارے بوجھ میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس مردہ بوجھ کے نیچے ہماری تخلیقی صلاحیت کی بیداری ناممکن ہوجاتی ہے۔

ہر روز اپنے اردگرد میں ایسے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو انہی خیالات کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں جنہیں وہ جانتے تک نہیں بلکہ دوسروں سے قبول کرتے ہیں۔ وہ خیال جسے ایک شخص نہ جانتا ہو یقینی طور پر بوجھ بن جاتا ہے۔

تعلیم کو خیالات کی قبولیت کا ذریعہ نہیں بننا چاہئے صرف وہی تعلیم بامعنی ہوسکتی ہے جس میں فعال فہم وفراست اور تخلیقی صلاحیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔

میں موضوع سے ہٹکر اس جوان کو تو بھول ہی گیا۔ اپنے خیالات کے اظہار کے بعد جب وہ چپ ہوا۔ حالانکہ یہ اس کے اپنے خیالات قطعی نہیں تھے۔ اسنے فخریہ انداز میں چاروں طرف نظر ڈالی اور تاثرات سے لگتا تھا جیسے کہہ رہا ہو "میں یہ بھی جانتا ہوں۔"

کچھ جاننا کتنا مشکل ہے لیکن علم کا فخر کرنا کتنا آسان۔ کچھ جان تو نہیں پاتے لیکن فخر کرنے لگتے ہیں۔ اور یاد رکھیں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آگاہی خود پسندی کی موت ہوتی ہے۔ جہاں خود پسندی ہو تو سمجھ لو کہ اسے آگاہی نہیں حاصل ہوئی۔ یہ آگاہی نہ ہونے کا ایک بین ثبوت ہے۔

آگاہی سے خود پسندی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ جانتا ہے اسے اتنا ہی زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا آگاہی سے وجود کی توضیح نہیں ہوتی، صرف آشکار ہوتی ہے۔ اور اس مقام پر جہاں کائنات کی پُراسراریت کے سامنے وجود ذات ہوتا ہے۔۔۔ اس انتہائی اہم مقام پر انسان خالی ہوجاتا ہے اور اسکا "میں" غائب ہوجاتا ہے۔ خود پسندی جہالت کے اندھیروں کی پیداوار ہے اور جب آگاہی کی روشنی ہوتی ہے تو وہ یکسر ختم ہوجاتا ہے۔

تھوڑی دیر تک میں خاموش رہا، پھر اس کے گوش گزار کیا۔ "میں تمہاری باتیں سننا چاہتا تھا لیکن تم نے کچھ بھی نہ کہا۔ تم نے جو کچھ بھی کہا، اسمیں سے کوئی بات تمہاری اپنی نہیں یہ سب مستعار لی ہوئی باتیں ہیں۔ اور دوسروں کی دولت سے امیری نہیں آیا کرتی۔ وہ غربت کو تو چھپا دیتی ہے لیکن ختم نہیں کرتی۔

حقیقت کے بارے میں صرف اپنے تجربات ہی زندہ حقائق ہوتے ہیں۔ اگر وہ حاصل ہوں تو انسان کی زندگی میں انقلاب رونما ہوجاتا ہے۔ ورنہ حقیقت اور سچائی کے متعلق مردہ خیالات کا بوجھ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور ذاتی تجربات کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔

ایسا علم جو اسکا اپنا نہ ہو، وہ آگاہی تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے شام ساکت ہو کر رک گئی ہو۔ مغرب کی جانب آفتاب کافی دیر سے بادلوں میں چھپا ہوا ہے لیکن ابھی تک رات نہیں ہوئی ہے۔ اندر اور باہر دونوں جگہ تنہائی کا راج ہے۔ میں قطعی اکیلا ہوں، کوئی شخص نہ تو اندر ہے اور نہ باہر۔

اس وقت میں کہیں نہیں ہوں یا یوں سمجھو کہ میں وہاں ہوں جہاں خلو یا خالی پن ہے۔ اور جب ذہن خالی ہو تو وہ ہوتا ہی نہیں۔

یہ ذہن عجیب و غریب حیرت انگیز چیز ہے۔ یہ ایک پیاز جیسا ہوتا ہے۔ ایک دن جب میری نگاہ ایک پیاز پر پڑی تو مجھے یہ مماثلت نظر آئی۔ میں نے پیاز چھیلی، اسے چھیلتا گیا یہاں تک کہ کچھ باقی نہ بچا۔ موٹی پرت، پھر پتلی پرت اور شفاف، پھر رفتہ رفتہ تمام پرتیں اتر گئیں اور کچھ بھی نہ بچا۔

اسی طرح ذہن بھی ہوتا ہے۔ تم اسکی پرتیں اتارتے جاؤ پہلے موٹی پرت اسکے بعد پتلی پرت اور بالآخر وہاں کچھ نہ بچے گا سوائے خالی پن کے۔ خیالات پھر جذبات پھر انا اور خود پرستی، اسکے بعد کچھ بھی نہیں صرف خالی پن۔ اسی خالی پن کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے ہم جو عمل کرتے ہیں وہ مراقبہ کہلاتی ہے۔ یہی خالی پن ہمارا حقیقی وجود یا ہمارا نفس ہے یعنی جو کچھ بچتا ہے وہی ہماری ذات ہے۔ اسے نفس کہیں، وجود کہیں، الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں۔ جہاں کوئی خیال، جذبات یا شعور ذات نہ ہو وہی سب کچھ ہے۔

Hume نے کہا ہے۔ "میں جب خود میں جھانکتا اور غوطہ لگاتا ہوں تو وہاں مجھے "میں" کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ وہاں بس خیالات ہیں جذبات ہیں یا کچھ یادداشت لیکن میری ذات کہیں بھی نہیں ہے۔" یہ رات ہے۔ لیکن ہوم صرف چند پرتوں کے بعد واپس ہو جاتا ہے، یہ ایک غلطی ہے۔ اگر وہ اور گہرائی میں جاتا تو وہاں پہنچ جاتا جہاں کچھ بھی نہیں سوائے حقیقی نفس کے جہاں ادھر کچھ بھی نہ ہو تو وہی میں ہوں۔ ہر چیز کی بنیاد خالی پن پر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص سطح سے ہی واپس ہو جائے تو کسی چیز سے بھی شناسائی نہیں ہو پائے گی۔

سطح کے اوپر دنیا ہے اور درمیان میں نفس ہے۔ سطح پر ہر چیز ہے جبکہ درمیان میں لاوجودیت ہے، خالی پن۔

میں ابھی ابھی سن باتھ (غسل آفتابی) سے واپس آیا ہوں۔ سردیوں میں سورج کی گرم کرنیں کتنا لطف فراہم کرتی ہیں سورج کو طلوع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے اور اسکی کرنوں میں رفتہ رفتہ حرارت بڑھ رہی ہے۔

میرے ساتھ ایک شخص تھا۔ میں پورے راستے خاموش رہا لیکن وہ گفتگو کرتا رہا۔ جیسا کہ میں نے سنا اور توجہ دی کہ ہم لوگ لفظ "میں" کی کتنی بار تکرار کرتے ہیں۔ ہر بات ہر چیز میں "میں" ہوتا ہے پیدائش کے بعد شاید "میں" کی ہی آگاہی ہوتی ہے اور مرتے وقت بھی آخری چیز یہی چھوڑی جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کے وقفے میں بھی یہی "میں" ہوتا ہے۔

"میں" کا لفظ کتنا مانوس ہے اور پھر بھی ہم اسے نہیں جانتے۔ انسانی زبان میں اس لفظ سے زیادہ کوئی دوسرا لفظ پراسرار نہیں۔ زندگی گزر جاتی ہے لیکن "میں" کی پراسراریت سے پردہ نہیں اٹھ پاتا۔

یہ "میں" ہے کیا؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ سے انکار بھی ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ تردید کے موقع پر بھی یہی استعمال ہوتا ہے۔ اگر نہ کہا جائے کہ "میں نہیں ہوں" تو بھی یہ حاضر ہے۔ انسان کو سمجھنے میں "میں" بڑا فیصلہ کن لفظ اور شک و شبہ سے بالا ذات ہے۔

"میں ہوں"۔ یہ آگاہی تو ہے لیکن میں کون ہوں یہ پیدائشی آگاہی نہیں ہے۔ اسے صرف روحانیت کے ذریعے ہی جانا جا سکتا ہے تمام روحانیت کی تگ و دو اسی "میں" کو جاننے کی جدوجہد ہے۔ تمام مذاہب تمام فلاسفرز نے اس واحد سوال کا جواب دیا ہے۔

"میں کون ہوں؟" یہ سوال ہر ایک شخص کو خود سے پوچھنا چاہئے۔

ہر چیز پس پشت ڈالکر یہ سوال کریں۔ صرف یہی سوال ہر ایک شخص کو لگاتار سنائی دیتا رہے۔ اس طرح یہ سوال دماغ کے لاشعور میں اتر جائے گا۔ جیسے ہی سوال گہرائی میں اترے گا، غیر ضروری شناخت غائب ہونا شروع ہو جائے گی۔ وہ یہ دیکھنا شروع کر دیگا کہ میں ایک جسم نہیں ہوں۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ میں ذہن نہیں ہوں۔ وہ یہ بھی دیکھنا شروع کر دیگا کہ میں وہ ہوں جو ہر چیز دیکھتا ہے۔ میں دیکھنے والا صاحب بصیرت ہوں۔ میں شاہد ہوں۔ اس تجربے سے "میں" کی حقیقت واضح ہوتی جائے گی۔ اور اس صحیح علم کے

آتے ہی خالص روشن خیالی ظاہر ہوجائے گی۔ اور زندگی کی پراسراریت کا دروازہ واہوجائے گا۔ہم جب خود سے روشناس ہوجائیں گے تو کائنات کی پراسراریت یا بھید بھی کھل جائیگا۔اگر ہم ''میں'' کو جان لیں تو خدا کو بھی جان لیں گے۔

یہی وجہ ہے جو میں کہتا ہوں کہ ''میں'' بڑی بیش قدر چیز ہے۔اسکی گہرائی میں اترنے کا نتیجہ ہر چیز سے پوری طرح آگاہی ہوگا۔

50

رات کی خاموشی میں شہر محوخواب ہے۔ میں اپنے مہمان کے ساتھ چہل قدمی کے بعد واپس آیا ہوں۔ راستے میں بہت سی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ مہمان ایک مادّہ پرست ہے (یہ نظریہ کہ تمام مادّہ ذی حیات ہے)۔

وہ بہت پڑھا لکھا اسکالر ہے۔ اس نے ایک طویل گفتگو کی جسے میں انتہائی خاموشی سے سنتا رہا پھر صرف یہ چیز پوچھی کہ کیا وہ ان خیالات کے اظہار کے دوران روحانی سکون کے ساتھ رہا یا نہیں؟

اس سوال پر وہ کسی قدر متفق ہوا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

بحث اور استدلال سچائی کی کسوٹی نہیں ہوتی یا پھر کسی کے خیالات۔ صرف روحانی تجربات ہی سچائی کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ اگر خبرداری یا چوکنا پن صحیح ہے تو نتیجتاً شعور خوشیوں سے پُر ہے۔ دماغ صرف نکتے تک پہنچنے کے لئے ہوتا ہے جبکہ خبرداری (Mindfulness) ایک شخص کو یہاں تک نہیں لائی۔ چنانچہ میں نے کہا ''میں تمہارے کسی بیان کو رد نہیں کرتا صرف درخواست گزار ہوں کہ تم اس سوال کو خود اپنے سے کرو۔

مذہب کسی مفکر کے خیالات نہیں بلکہ یہ روحانی شعور تک پہنچنے کی سائنس ہے۔ اسکو بحث اور دلیل سے نہیں پرکھا جاتا بلکہ تجربات سے پرکھتے ہیں۔ یہ سچائی کے اجزا کی جانچ نہیں۔ یہ سچائی اور اس تک پہنچنے اور حاصل کرنے کی جدوجہد یا کوشش ہے۔

51

میں ایک کٹیا میں بیٹھا ہوں۔ چھپّر کی چھت سے سورج کی روشنی دائروں کی شکل میں فرش پر پڑرہی ہے۔ روشنی کے دھارے میں غبار کے چھوٹے چھوٹے ذرے تیر رہے ہیں۔ یہ ذرات روشنی کا حصہ تونہیں لیکن انہوں نے روشنی کو ناخالص کردیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ روشنی کو چھونہیں سکتے کیونکہ مختلف اطراف سے بیرونی عناصر میں اور انکی وجہ سے روشنی ناخالص دکھائی دے رہی ہے۔ پھر بھی روشنی اب بھی روشنی ہے کیونکہ اسکی ذاتی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن اسکا جسم، اسکی صورت ناخالص ہوگئی ہے۔ کیونکہ ان بیرونی عناصر کی وجہ سے میزبان کی صورت بدل گئی ہے۔

انسان کی روح میں بھی ایک ایسی ہی تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہاں بھی گردوغبار کے بہت سارے ذروں نے انسان کی حقیقی فطرت کو چھپا رکھا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مہمانوں کے اژدہام میں میزبان نے اپنی حیثیت گنواں دی ہے کہ وہ پہچانا ہی نہیں جاتا۔ کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو زندگی سے ملنا اور اسکا مطلب جاننا چاہتے ہیں انکے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس اژدہام میں دیکھیں کہ میزبان کون ہے۔ بغیر اس میزبان کو جانے بوجھے زندگی ایسی ہے جیسے خوابیدہ خرامی۔ بیداری میزبان کو پہنچاننے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ پہنچان خود آگاہی ہے۔ اس پہنچان کے بعد اس سے شناسائی ہوتی ہے جو ذات ابدی (خدا) ہے۔

روشنی گرد کے ذرات کی وجہ سے ناخالص نہیں ہوئی۔ نہ ہی روح۔ روشنی پھیکی ہوگئی جبکہ روح بھلادی گئی۔

روح کی روشنی پر کس قسم کے ذرات چھائے ہوئے ہیں؟ ہمارے اندر باہر سے جتنی بھی چیزیں آئی ہیں وہ گردوغبار ہیں۔ ہمارے اندر اس غبار کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ بدھا نیچر ہے۔ ہمارے حواس نے جن چیزوں کو اکٹھا کر رکھا ہے وہ گردوغبار ہے۔

ہمارے اندر وہ کیا چیز ہے جسے حواس نے جمع نہیں کیا ہے؟ یعنی ذائقہ محسوس کرنے کی قوت، سونگھنے کی قوت، چھونے کی قوت، سننے کی قوت اسکے علاوہ ہمارے اندر کیا ہے؟ وہ جسے ہمارے حواس نے جمع نہیں کیا۔ شعور اور آگاہی اور صرف وہی سچائی ہے یہ قوت

حواس سے نہیں آئی بلکہ یہ انکے پیچھے ہے۔

یہی شعوروآگاہی میری صحیح فطرت یا سرشت ہے۔ اس کے علاوہ ساری چیزیں ناگوار گردوغبار ہیں۔ یہی اکیلا میرا میزبان ہے۔ باقی چیزیں مہمان ہیں۔ اس شعوروآگہی کو ہی جاننا اور گرد کے پردے سے نکالنا ہے۔ صرف اسی شعوروآگہی کو پانا ہی دولت پانا ہے جو کبھی خراب اور رائیگاں نہیں ہوتی۔

پو پھٹے کی کہر میں آخری ستارہ چھپ رہا ہے۔ صبح ہونے والی ہے۔ مشرقی آسمان پر سفیدہ سحری پھیل گیا ہے۔

ایک دوست نے ابھی ابھی ایک عزیز کی موت کی اطلاع دی ہے۔ اسی رات اس نے اپنا جسم چھوڑا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے موت پر گفتگو شروع کردی۔ اس نے بہت سی باتیں کیں اور آخر میں سوال کیا۔ ''موت روز کا معمول ہے پھر بھی لوگ اس طرح رہتے جیسے موت کبھی نہیں آئیگی۔ کسی کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ اسے بھی مرنا ہے۔ اتنی اموات کے درمیان نہ مرنے کا یقین کیونکر ہوتا ہے؟''

یہ یقین بڑا معنی خیز ہے۔ ایسا اس لئے ہے کیونکہ ایک شخص جو فانی جسم میں وجود رکھتا ہے وہ فانی نہیں ہے۔ حالات تو بظاہر موت کے ہوتے ہیں لیکن مرکز میں موت نہیں ہوتی۔

ایک شخص جو دیکھ رہا ہے۔ جسم کا صاحب بصیرت اور ذہن جانتا ہے کہ وہ جسم اور ذہن سے الگ ہے۔ فانی جسم کا صاحب بصیرت فانی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے۔ ''کہ مجھے موت نہیں ہے۔ موت صرف تبدیلی جسم ہے۔ میں ابدی ہوں۔ یہاں تک کہ موت سے گزرتے ہوئے ''میں'' جسے موت نہیں، باقی رہتا ہے۔''

لیکن یہ آگہی غیر شعوری ہے۔ اسے شعوری بنانے کے لئے بندش کو دور کرنا ضروری ہے۔ موت براہ راست دکھائی دیتی ہے جبکہ غیر فانی ہونے کا ادراک بالواسطہ ہوتا ہے۔

اس زندگی کو حاصل کرنا جو زندگی اور موت کی حدود سے باہر ہے وہ آزادی اور خودمختاری ہے۔ یہ ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ اس سے صرف آگاہ ہونے کی ضرورت ہے۔

کسی نے ایک دانا حکیم سے پوچھا۔ ''زندگی کیا ہے اور موت کیا؟ میں تم سے یہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں۔''

حکیم نے اس کے جواب میں بہت باتیں کیں۔ اس نے کہا ''پھر کہیں اور جاؤ۔ جہاں میں ہوں وہاں نہ تو موت ہے اور نہ زندگی۔''

گزشتہ کل میں نے کہا تھا۔ ''گندگی پھول بنتی ہے، غلاظت اور کوڑا کرکٹ کھاد بنکر خوشبو میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ انسان کے جذبات اور لگاؤ وغیرہ بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ وہ قوت ہیں۔ اگر انکا رخ تبدیل کردیا جائے تو شان خداوندی مل جاتی ہے۔''

چنانچہ دنیاوی زندگی بیج کی شکل میں الوہیت ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی چیز غیر مقدس نہیں۔ جس چیز کا بھی وجود ہے اس میں شان خداوندی ہے۔ ہر چیز مقدس ہے فرق صرف اس شان کے ظہور اور نمود میں ہے۔

اس نظر سے دیکھا جائے تو کوئی بھی چیز قابل نفرت نہیں۔ ایک سرے پر حیوان ہے لیکن دوسرے پر مقدس شان۔ حیوانیت اور شان خداوندی کے درمیان کوئی تضاد نہیں صرف آگے بڑھنے کا ہے۔ ایسی صورت حال میں خود پر پابندیاں لگانا اور خود کو اذیت دینا بے معنی بات ہے۔ اس قسم کی جدوجہد غیر سائنسی ہے کہ خود کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دے، اس طرح کوئی بھی سکون اور خود آگاہی نہیں پاسکتا۔ ہم اپنی حیثیت اور شخصیت مٹا نہیں سکتے۔ اسے شعور سے الگ رکھ سکتے ہیں۔

لیکن جس چیز کو روکا ہے اسے لگاتار روکنا ہے۔ جس کو مغلوب کیا ہے اسے بار بار مغلوب کرنا ہے۔ اس راستے سے کامیابی نہیں مل سکتی۔

صحیح راستہ قطعی مختلف ہے۔ اسے روکنا اور مغلوب کرنا نہیں ہے بلکہ اسکا ادراک ہے۔ گندگی اور غلاظت کو خارج کرنا نہیں۔ کیونکہ گندی کا ڈھیر تو ہم بھی ہیں۔ اسے تبدیل کرنے کے بعد کھاد بنانا ہے۔ جیسا کہ قدیم کیمیا میں دھات کو سونا بنانے کا ذکر ہے۔

54

مہاویرا نے کہا ہے۔ "او طلبگار، آدمی رہنے میں کیا خوف ہے؟"

گزشتہ کل مجھ سے کسی نے ایسی ہی بات پوچھی تھی۔ اور چاہے کوئی پوچھے یا نہ پوچھے، یہ سوال ہر شخص کی آنکھوں میں چمک رہا ہے۔ شاید یہ ہمیشہ پوچھا جانے والا سوال ہے اور شاید یہ انتہائی اہم سوال ہے۔

ہر ایک شخص خوف زدہ ہے۔ جانے یا انجانے میں خوف رینگتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ بیٹھے ہوں، کھڑے ہوں، سو رہے ہوں یا جاگ رہے ہوں یہ خوف مسلسل ہے۔ ہمارے ہر کام میں خوف ہے۔ ہر خیال اور ہر شعوری عمل میں۔ محبت میں خوف ہے، ہر اچھائی میں، ہر گناہ میں، گویا ہر ایک چیز ہر ایک بات میں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہماری ذات کو خوف سے تعمیر کیا گیا ہو۔ ہمارا ایمان جو بھی ہے، تصورات، مذہب اور خدا، خوف کے علاوہ کیا ہے؟

یہ خوف ہے کیا۔ ویسے تو خوف کی بہت ساری اقسام ہیں لیکن خوف صرف ایک ہے۔ موت کا خوف یہ ایک بنیادی خوف ہے۔ خوف کی جڑوں میں یہ بات پنہاں ہے کہ کہیں وجود ہی نہ ٹوٹ پھوٹ اور انہدام کا شکار ہو جائے۔ خوف کا مطلب وجود کے نہ رہنے کا وسوسہ ہے کہ وہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ پوری زندگی اس تشویش سے فرار ہونے میں گزر جاتی ہے۔ تمام تر کوششیں اس بنیادی عدم تحفظ سے محفوظ رہنے میں گزر جاتی ہیں۔

لیکن پوری زندگی کی دوڑ بھاگ کے باوجود زندگی کو اطمینان نہیں مل پاتا۔ دوڑ بھاگ اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے یہ عدم تحفظ قائم و دائم رہتا ہے۔ زندگی پوری ہو جاتی ہے لیکن موت کا خوف باقی رہتا ہے۔ اس کے برخلاف زندگی پوری ہونے کے بعد موت آنے پر مرنے والے کو کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اس وقت مرنے والے کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ جیسے زندگی کبھی نہیں رہی صرف موت نمو ہوتی رہی تھی یہ ویسا ہی ہے جیسے زندگی اور موت بجائے خود موت کی طرف کشش رکھتی ہیں۔

موت کا خوف آخر کیوں؟ موت تو نامعلوم چیز ہے، موت غیر مانوس ہوتی ہے۔ پھر اس سے خوف کیسا؟ کسی انجان چیز سے کیا تعلق کیسا واسطہ؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم جسے موت کا خوف سمجھتے ہیں وہ موت کا خوف نہیں ہے۔ یہ خوف اس چیز کے ختم ہونے کا ہوتا ہے جسے ہم زندگی کے طور پر جانتے ہیں۔ یہ خوف اس

چیز کا ہے جسے ہم جانتے ہیں۔ ہم نے خود اپنی نشان دہی اس چیز سے کر رکھی ہے جسے ہم جانتے ہیں۔ ہماری ہستی صرف اسی کے دم سے ہے۔ صرف وہی ہماری زندگی بنی ہوئی ہے۔ میرا جسم، میری دولت، میرا وقار، میری رشتہ داریاں، میرا ایمان، میری سوچ۔ یہ تمام چیزیں مل کر "میری" زندگی اور "میں" بنا ہوں۔ موت اس "میں" کو کہیں لے جائے گی۔ بس یہ خوف ہے۔ ان تمام چیزوں کو اسی لئے اکٹھا کرتے ہیں تاکہ خوف کو رفع کریں باتحفظ حاصل کریں لیکن ہوتا اس کے برخلاف ہے۔۔۔ ان تمام چیزوں کے چلے جانے کا وسوسہ خوف بن جاتا ہے۔

مختصراً انسان جس منزل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے، کیا ملتا ہے۔ خوشیوں کے حصول کے لئے نادانی میں جتنے قدم اٹھائے جاتے ہیں وہ دکھوں پریشانیوں پر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ بے خوفی کے عالم میں پہنچنے کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا جاتا ہے وہ خوف تک لے جاتا ہے۔ جو کچھ وجود کے لئے کیا جاتا ہے وہ وجود تو نہیں۔ ایک شخص اگر اس حقیقت کے لئے آنکھ کھولنے کا اہل ہے۔۔۔ اگر ہم یہ سمجھ سکیں کہ ہم نے "میں" کو جو کچھ سمجھ رکھا ہے وہ میں نہیں ہوں تو خوف ختم ہو سکتا ہے۔ موت پر صرف "دوسری چیزیں" (یعنی میرا جسم، میری ثروت، میرا وقار، میری رشتہ داریاں، میرا ایمان، میری سوچ وغیرہ) ختم ہوتی ہیں۔

اس حقیقت کو جاننے کے لئے کسی رسم و رواج، کسی تکنیک کے اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک شخص کو صرف سمجھنا ہے، ان تمام چیزوں کے خواب سے بیدار ہونا ہے جسے ہم "میں" سمجھتے ہیں۔ صرف ان چیزوں کو پہچاننا ہے کہ "میں" وہ نہیں ہوں، جسے سمجھتا ہوں۔ بیداری اس شناخت کو تسلیم کردے گی۔ بیداری ذات یا "میں" کو دوسری چیزوں سے الگ کردے گی۔ اپنی حقیقی ذات اور دوسری چیزوں کو ایک سمجھنا خوف ہے۔ اور اس بات سے آگاہ ہو جانا کہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں خوف کا خاتمہ ہے یعنی بے خوفی۔

55

ایک حکیم نے اپنی کٹیا کے مکینوں کو سفر پر بھیجا تا کہ وہ دنیا کے بڑے اسکول سے سیکھ کر علم حاصل کریں۔ مقررہ وقت گزرنے کے بعد سب لوگ واپس آ گئے لیکن ایک شخص نہیں آیا۔ حکیم اپنے عمل کے نتائج دیکھ کر خوش ہوا کہ انہوں نے علم حاصل کیا ہے۔ وہ سب کے سب کافی کچھ سیکھ کر واپس آئے ہیں۔

بالآخر دوسرا طالب علم جواب تک واپس نہیں آیا تھا وہ بھی آ گیا۔ حکیم نے اس سے کہا۔ ''تم سب سے آخر میں آئے ہو، تم نے دوسروں سے زیادہ علم حاصل کیا ہوگا؟''

جوان شخص نے جواب دیا۔ ''میں بغیر کچھ سیکھے پڑھے واپس ہوا ہوں۔ بلکہ اس کے برخلاف، وہ بھی بھول گیا ہوں جو تم نے پڑھایا تھا۔''

''یہ کتنا مایوس کن جواب ہے؟''

ایک دن وہ جوان حکیم کی مالش کرتے ہوئے جب پیٹھ تک پہنچا تو بڑبڑانے کے انداز میں خود اپنے سے کہنے لگا۔ ''عبادت گاہ (مندر) تو بہت خوبصورت ہے لیکن اسکا اندرونی حصہ تقدس اور نور الٰہی سے خالی ہے۔'' حکیم نے جوان کی بات سن لی اور اسے غصہ آ گیا۔ یقیناً یہ الفاظ اسی کے لئے کہے گئے تھے۔ اسمیں بھی شک نہیں اسکے خوبصورت جسم کو مندر سے تشبیہ دی گئی تھی۔ حکیم کے غصہ کو دیکھ کر جوان ہنسنے لگا۔ یہ جلتی پر تیل ڈالنے جیسا تھا حکیم نے اس کو کٹیا سے نکال دیا۔

اور ایک صبح جب حکیم مقدس صحیفے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اتنے میں جوان شخص عام سے انداز میں اندر داخل ہوا اور حکیم کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ آ کر وہاں بیٹھا لیکن حکیم اپنے مطالعہ میں مشغول رہا۔ عین اس وقت ایک شہد کی مکھی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہی دروازہ جس سے وہ داخل ہوئی تھی۔ لیکن شاید اسے نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے وہ بند کھڑکی سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی بھنبھناہٹ مندر کے خاموش ماحول میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔ جوان شخص نے اٹھتے ہوئے بلند آواز میں مکھی سے کہا۔ ''بے وقوف وہاں دروازہ نہیں ہے۔ یہ دیوار ہے رک کر اپنے پیچھے دیکھ۔ اس جانب وہی دروازہ ہے جس سے تو اندر آئی تھی۔''

اس آواز کو، مکھی نے تو نہیں لیکن استاد نے سنا اور اسے دروازہ مل گیا۔ اس نے جوان

آدمی کی آنکھوں میں پہلی بار دیکھا۔ یہ اس جوان کی آنکھیں نہیں تھیں جو سفر پر گیا تھا۔ یہ آنکھیں بہت مختلف تھیں۔ اب استاد کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ جوان شخص نے جو کچھ سیکھا ہے وہ عام تعلیم نہیں وہ آگاہی حاصل کرنے کے بعد ہی واپس آیا تھا مطالعے سے حاصل کئے ہوئے علم کو حاصل کرنے کے بعد نہیں۔

استاد نے اس سے کہا۔ ''مجھے آج یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ میرا مندر تقدس اور خدا کے نور سے خالی ہے۔ ابھی تک میں دیوار سے اپنا سر پھوڑ رہا تھا اور مجھے دروازہ نہیں ملا ہے۔ مجھے دروازے کی تلاش میں کیا کرنا چاہئے؟ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ میرا مندر تقدس اور خدا کے نور سے خالی نہ رہے؟''

جوان آدمی نے جواب دیا۔ ''اگر تم تقدس اور خدا کے نور کے طالب ہو تو اپنے آپ کو خالی کرو۔ تم جس میں سب کچھ بھرا ہوا ہے، وہ خدا کے نور سے خالی ہے۔ وہ شخص جو خود کو خالی کر لے اسے ہمیشہ کے لئے خدا کا نور حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگر تم اس سچائی کے دروازے کی تلاش کے خواہشمند ہو تو وہ کرو جو اس وقت شہد کی مکھی کر رہی ہے۔''

استاد نے اُدھر دیکھا لیکن مکھی اس وقت کچھ نہیں کر رہی تھی وہ دیوار پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صرف بیٹھی ہوئی۔ وہ سمجھ گیا۔ وہ بیدار ہو گیا۔ اسے لگا کہ جیسے یکا یک تاریکی کو تیز روشنی نے منور کر دیا۔ اس نے بھی دیکھا کہ مکھی اس وقت دروازے سے باہر جا رہی ہے۔

میرا پورا پیغام یہی کہانی ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے میں کہہ رہا ہوں۔ خدا کو پانے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر عمل چھوڑ کر دیکھنا چاہئے۔ جب ذہن پر سکون ہو جائے تو دروازہ مل جائے گا۔ پر سکون اور خالی ذہن ہی دروازہ ہے۔

میں تم سب لوگوں کو اس خالی پن کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ یہ دعوت مذہبی بھی ہے۔ اس دعوت کو قبول کرنے کا مطلب مذہبی ہونا ہوگا۔

نیلے آسمان کے نیچے آفتاب کی تمازت پھیلنا شروع ہوگئی ہے۔ سرد ہوائیں بوجھل اور گھاس پر شبنم کے قطرے بخ ہیں۔ پھولوں پر موجود اوس قطروں کی صورت میں ٹپک رہی ہے۔ رات کی رانی پوری رات اپنی خوشبو بکھیرنے کے بعد سونے کے لئے چلی گئی ہے۔

ایک مرغا بانگ لگاتا ہے جس کا جواب فاصلے پر موجود دوسرے مرغے بھی دیتے ہیں۔ ہلکی ہلکی ہواؤں میں درخت نزاکت سے ہل رہے ہیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ نہ ختم ہونے والے نغمے کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ صبح ہر چیز پر اپنی نشانی چھوڑ رہی ہے۔

بیٹھے ہوئے میری نگاہیں اس راستے پر ہیں جو آگے چل کر درختوں کے اژدہام میں گم ہوگیا ہے۔ آہستہ آہستہ سڑک آنے جانے والوں سے بھرتی جارہی ہے۔ وہ چل تو رہے ہیں انکے چہرے سے خوابیدگی عیاں ہے۔ نیند کے اندرونی خمار نے ان سب کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ صبح کے ان خوشگوار لمحات میں بیدار نہیں ہو سکے شاید وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ کائنات کے پیچھے ان لمحات میں کیا آشکار ہو رہا ہے۔

زندگی میں کتنی نغمگی ہے۔ اور انسان کتنا بہرا ہے۔

زندگی میں کتنا حسن ہے۔ اور انسان کتنا نابینا ہے۔

زندگی میں کتنی ترنگ ہے۔ اور انسان کتنا بے حس ہے۔

ان دنوں میں پہاڑیوں پر تھا۔ ہم لوگ کافی عرصے تک پہاڑ پر رہے۔ لیکن وہ لوگ جو میرے ساتھ آئے تھے وہ زندگی کی عام سی گفتگو تک محدود رہے۔ ایسی باتیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ زندگی میں انکی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان باتوں کے بادلوں نے پہاڑ کے حسن کو چھپا دیا تھا۔

اس غیر اہم گفتگو میں لپٹا میں اس لامحدود ذات سے ناواقف رہا اور وہ چیزیں جو انتہائی قریب تھیں، ہم سے دور رہیں۔

میری خواہش بنی نوع انسان سے یہ کہنے کی ہے کہ تمہارے پاس گنوا دینے کے لئے کچھ اور نہیں صرف بے بصری ہے جبکہ حاصل کرنے کے لئے ہر ایک چیز ہے۔ اے خودساختہ دست طلب بڑھانے والو، اپنی آنکھیں کھولو۔

گزشتہ دوپہر ہم لوگ ایک چھوٹے سے پہاڑ کے نیچے ایک درّے میں تھے۔ روشنی اور سائے میں ہم نے چند خوشگوار گھنٹے گزارے قریب ہی ایک تالاب تھا جسے طاقتور ہوا کے جھونکوں نے مضطرب کر رکھا تھا۔ پانی کی لہریں اٹھتیں، بیٹھتیں اور ختم ہو جاتیں۔ اسکی ہر چیز احتجاج کر رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ''دیکھو، دیکھو مضطرب شخص بھی پرسکون ہوسکتا ہے۔ اضطراب میں سکون پنہاں ہوتا ہے۔ تالاب اس گھڑی پرسکون تھا لہریں صرف سطح آب پر تھیں۔ سکون اور سکوت اس کے اندر پہلے بھی تھا۔''

انسان بھی سطح پر مضطرب ہوتا ہے۔ لہریں صرف سطح پر ہوتی ہیں۔ اسکے اندر، گہرائی میں مکمل سکوت ہوتا ہے۔ جب ہم خیالات کے طوفان سے نکلتے ہیں تو پرسکون تالاب دکھائی دیتا ہے۔ اس تالاب کو اس وقت نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ وقت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وقت صرف اس وقت ہوتا ہے جب خیالات کا اژدہام ہو۔

مراقبہ وقت سے آزاد ہوتا ہے۔

حضرت عیسٰی نے کہا تھا۔ ''اور وقت طویل نہیں ہوگا۔'' وقت میں دکھ اور پریشانیاں ہیں۔ وقت خود دکھ ہے۔ وقت سے الگ ہونا، خوشیوں میں ہونا ہے۔

دوستو، آؤ وقت سے پرے چلیں۔ ہم جہاں ہیں وہ بھی وہیں ہے۔ جو کچھ وقت میں ہے وہی وقت سے پرے بھی ہے۔ اسکو جاننا ہے۔ وہ لمحہ جب کوئی اس سے واقف ہوتا ہے تو ہواؤں کے جھکڑ رک جاتے ہیں اور تالاب پرسکون ہو جاتا ہے۔

میں انسان کے چاروں جانب الفاظ ہی الفاظ دیکھتا ہوں لیکن صفحے اور الفاظ سب بیکار ہیں۔ ان کے ذریعے ایک شخص سچائی کے متعلق جان سکتا ہے لیکن سچائی جاننے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔

خود کو الفاظ کے ذریعے نہیں سمجھا جاسکتا۔ خود تک پہنچنے کا دروازہ خالی پن ہے۔ الفاظ سے بے زبانی کی طرف جست لگانے کے جرات ہو تو وہ مذہبیت ہوگی۔

خیالات دوسروں کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں، اس سے اپنی ذات کو نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ اپنی ذات اسکی پشت پر ہوتی ہے۔ اپنی ذات ہر چیز سے بلند ہے۔ اپنی ذات ہی کے ذریعے ہم خود سے پہلے ہوئے ہیں۔ یہ بھی دوسرا ہے۔ اگر وہ نہیں ہے۔ وہ جو کہ حقیقتاً ہے۔ اس سے قبل میں باشعور ذات ہوں، اسکے اندر میں ہر ہمن ہوں۔

سچائی میں، ہونے میں، اپنی ذات اور دوسرے نابود ہیں۔ یہ فرق بھی خیالات کی بناء پر تھا۔

شعور کے تین پہلو ہیں۔

۱) بیرونی لاشعور اندرونی لاشعور۔

۲) بیرونی شعور۔ اندرونی لاشعور، اور

۳) بیرونی شعور۔ اندرونی شعور۔

پہلا پہلو لاشعور، وہ بے شعوری ہے۔ وہ بے روح ہے۔ یہ خیالات سے پہلے کا اسٹیج ہے۔ دوسرا پہلو، نصف لاشعور، یہ نصف شعور ہے۔ یہ روح اور بے روح کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ خیالات کا مرحلہ ہے۔ تیسرا پہلو non unconseious ness ہے یہ مرحلہ کامل شعوری اور خیالات سے پرے ہوتا ہے۔

سچائی تک پہنچے کے لئے ایک شخص کو عدم خیالات تک ہی نہیں پہنچنا ہوتا۔ وہ صرف بے حسی (بے روح) سے لاشعوری تک لیجاتے ہیں۔ شراب، سیکس اور موسیقی وغیرہ بھی صرف لاشعور تک پہنچاتے ہیں۔ لاشعوری میں صرف فرار ہے۔ اس میں کوئی حصول نہیں۔

ایک شخص کو سچائی تک پہنچنے کے لئے دو چیزوں کا حصول ضروری ہے یعنی خیالات سے خالی ذہن اور شعور۔ اس مقام کو سمادھی اور روشن خیالی کہتے ہیں۔

یہ پورے چاند کی رات ہے لیکن آسمان بادلوں سے ڈھنکا ہوا ہے۔ میں ابھی ابھی ایک راستے سے آیا ہوں۔ ریت کے ایک ٹیلے کے قریب چند بچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے ریت سے ایک محل تعمیر کیا تھا لیکن انکے درمیان اختلاف ہوگیا۔ تمام اختلافات ریت کے محل پر ہی جنم لیتے ہیں۔ وہ بہر حال بچے تھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں کچھ مزید لوگ شامل ہوگئے جو بچے نہیں تھے۔ بچوں کی لڑائی میں بڑے بھی شامل ہوگئے۔

میں سڑک کے کنارے کھڑا سوچتا رہا کہ بڑوں اور بچوں کی تقسیم کتنی غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ جو سچ پوچھو تو عمر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح بلوغت اور پختگی کا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ بچے کی حیثیت میں ہی مرجاتے ہیں۔ lao tzu کی ایک کہانی ہے کہ وہ ایک بوڑھے شخص کی حیثیت سے پیدا ہوا تھا۔ یہ قطعی غیر قدرتی لگتا ہے لیکن کیا اس سے زیادہ غیر قدرتی یہ نہیں کہ ایک شخص اپنی زندگی کے اختتام تک پختہ کار (MATURE) نہ ہو پائے؟ جسم بڑھتا رہتا ہے لیکن دماغ اپنی جگہ رکا رہتا ہے۔ یہ اسی لئے ہوا کہ ریت کے محل پر ہونے والی لڑائی میں خود بڑے بھی شامل ہوگئے۔ اور انسانیت کو پس پشت ڈالتے ہوئے، اس بات کا ثبوت پیش کرنے لگے کہ تدریجی ترقی وغیرہ کی باتیں فضول ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آدمی حیوان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ کیونکہ وہ ابھی تک حیوان کے علاوہ کچھ نہیں۔ کیا انسان ابھی تک پیدا نہیں ہو؟

انسان کو گہرائی تک دیکھنے کے بعد اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جاسکتا Diogenes نے چمکتے دن کی روشنی میں بھی لالٹین لیکر گھومنے کے بعد کہا۔ ''میں انسان کو تلاش کررہا ہوں۔'' جب وہ بہت بوڑھا ہوگیا تو ایک شخص نے پوچھا کہ کیا تمہیں اب بھی امید ہے کہ آدمی ملجائے گا۔

(اسنے کہا۔ ''ہاں۔ کیونکہ میرے پاس اب بھی جلتی ہوئی لالٹین ہے۔''

میں وہاں کھڑا ہوا تھا کہ بہت سے لوگ ریت کے ٹیلے کے قریب جمع ہوگئے اور انتہائی دلچسپی سے دھمکیوں، توہین آمیز باتوں، گالیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان تمام لوگوں کی آنکھوں میں مخصوص قسم کی چمک بھی تھی ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو لڑ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں اور عمل سے حیوانی لطف عیاں تھا۔

جبران نے لکھا ہے۔ ''ایک دن میں نے بھیج کاگ (کھیت میں پرندوں کو ڈرانے والا آدمی نما پتلا) سے جو کھیت کے بیچ میں کھڑا ہوا تھا پوچھا۔ کیا تم کھیت میں ساکت کھڑے ہوئے بور نہیں ہوتے؟'' اسنے جواب دیا'' اوہ نہیں، پرندوں کو ڈرانے کا لطف اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔'' ایک لمحے تک غور کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''سچ کہتے ہو، مجھے خود بھی اس لطف کا تجربہ ہے۔ بھیج کاگ نے کہا۔'' ہاں، صرف وہ جن کے جسم میں گھانس پھوس خوب بھرا ہو، وہ اس لطف سے آگاہ ہیں۔''

لیکن ایسا لگتا ہے ہر شخص ہی اس لطف سے آگاہ ہے۔ کیا ہم سب لوگوں کے اندر بھی گھاس پھوس بھرا ہوا ہے؟

کیا ہم سب لوگ بھی کھیت میں کھڑے ہوئے'' بھیج کاگ'' نہیں ہیں؟

میں اس لطف کو دیکھ کر واپس آیا ہوں۔ کیا اس طرح کا لطف پوری دنیا میں نہیں پھیلا ہوا ہے؟

میں نے یہ بات خود سے پوچھی اور رویا۔ میں اس شخص پر رویا جو پیدا ہوسکتا ہے لیکن پیدا نہیں ہوا۔ یہ چیز ہر شخص میں ہے لیکن چھپی ہوئی جیسے راکھ میں انگارا چھپا ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ جسم گھاس پھوس کے ڈھیر سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسے موقع پر جو لوگ وہاں رکیں انکے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ کسی کھیت پر موجود ہوں۔ وہاں کم از کم انکی اس طرح افادیت ہوگی وہ کھیت کو پرندوں سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ انسان تو اتنے کام کا بھی نہیں ہے۔

حقیقتاً کوئی شخص بھی اس وقت تک انسان نہیں بن سکتا جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ جسم کے باہر کیا ہے اور یہ کہ روح کیا ہے۔ آدمی کی حیثیت سے پیدا ہونا ایک بات ہے اور'' آدمی'' ہونا بالکل مختلف بات۔

آدمی خود اپنے اندر سے انسان پیدا کرتا ہے۔ یہ لباس جیسی بات نہیں ہے، جس سے ایک شخص اپنے جسم کو ڈھانکتا ہے۔ کوئی بھی شخص خود کو انسان کے لبادے میں چھپا کر انسان نہیں بن سکتا کیونکہ وہ اسے اسی وقت تک انسان رکھ سکتا ہے جب تک کہ سچ مچ انسان ہونے کی ضرورت نہ پڑے یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اسکا لبادہ کس وقت اتر جائیگا۔

ویسے ہی جیسے ایک بیج اپنی حیثیت تبدیل کر کے کونپل بن جاتا ہے۔ کسی لباس کو پہن

کر کونپل نہیں بنتا۔ ویسے ہی ادمی کو اپنی زندگی کی طاقت سے مکمل طور پر قلب ماہیت کرنے کے بعد مکمل طور پر نیا پہلو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ اسی وقت وہ پیدا ہوا اور صرف اسی وقت قلب ماہیت ہوئی۔

پھر اسے کانٹا بونے میں لطف نہیں آئے گا بلکہ قلب ماہیت کے بعد کا بٹا چننے اور پھول بکھیرنے میں لطف محسوس ہوگا۔ اس لمحے یہ ثبوت مل جائے گا کہ وہ اب گھاس پھوس نہیں رہا بلکہ ایک آدمی ہے۔ وہ جسم نہیں بلکہ روح ہے۔

gurdjieff نے کہا ہے۔'' اس فریب اور غلط فہمی کو ختم کردو کہ ہر شخص میں ایک روح ہے۔'' اس چیز کی کیا اہمیت ہے کہ وہ جو سو رہا ہے، روح رکھتا ہے یا نہیں؟ صرف وہی حقیقت ہے جو واقعتاً ہے۔ سب کی روح ممکن ہے لیکن وہ شخص جو اسے حقیقت بناتا ہے تنہا اسے پاتا ہے۔

60

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کا تمام تر شعور تین چھوٹے چھوٹے الفاظ کے گرد گھومتا ہے۔ وہ تینوں الفاظ کون سے ہیں؟ بیدار ذہن (wakeful intelligence)، جاننے اور سوچنے کی طاقت (intellect)، اور جبلت انسانی اور وجدان (instinct)

ایک انتہائی اچھی ہستی اپنے بیدار ذہن کے مطابق عمل کرتی ہے۔ درمیانے درجے کی ہستی اپنی جاننے اور سوچنے کی طاقت کے مطابق عمل کرتی ہے۔ شعور کی سب سے نچلی حالت کے لوگ اپنی جبلت اور وجدان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

جبلت چاہے وہ انسانی ہو یا حیوانی، اس میں حیوانیت ہوتی ہے۔۔۔ جاننے اور سوچنے کی طاقت انسانی ہوتی ہے۔ جب کہ بیدار ذہن دیوتائی قوت کا حامل ہوتا ہے۔

جبلت قدرتی اور اندھی ہوتی ہے۔ یہ بیکاری میں وقت گزاری ہے۔ یہ غیر شعوری دینا ہے۔ نہ تو اچھا نہ برا۔ اس میں تفریق نہیں ہوتی چنانچہ اس میں اندرونی جدوجہد نہیں ہوتی۔ اس میں اندھے جذبات کا قدرتی بہاؤ ہوتا ہے۔

جاننے اور سوچنے کی طاقت نہ تو بیکاری میں وقت گزاری ہے اور نہ بیدار ذہنی۔ یہ نیم شعوری ہے۔ یہ بیدار ذہنی اور جبلت کی عبوری حالت ہے۔ یہ ایک راہداری ہے۔ اسکا ایک حصہ شعور بن جاتا ہے جبکہ بقیہ لاشعور۔ چنانچہ یہاں فرق کی پہنچان ہوتی ہے۔ یہیں سے اچھائی اور برائی پیدا ہوتی ہے۔ یہیں سے جذبات اور خیالات ہوتے ہیں۔

بیدار ذہن مکمل بیدادی ہے۔ یہ خالص شعور ہے۔ یہ صرف روشنی ہے۔ یہاں بھی جدوجہد نہیں۔ یہ قدرتی ہے۔ یہ اچھائیوں کا قدرتی بہاؤ ہے۔ صحیح اور خوبصورت۔

جبلت قدرتی، بیدار ذہن بھی قدرتی جبلت قدرتی اندھا پن، بیدار ذہنی قدرتی بیدار۔ صرف جاننے اور سوچنے کی طاقت غیر قدرتی ہے۔

جاننے اور سوچنے کی طاقت کے پیچھے جبلت اور آگے بیدار ذہن۔۔۔ اس روشنی کی لو بیدار ذہن کی جانب اور اسکی بنیادی جڑیں جبلت اور وجدان کی طرف۔ سطح ایک چیز ہے، جڑیں دوسری یہ ایک کھنچاؤ ہے۔ ترغیب وتحریص جانور بنانے کی جبکہ چیلنج دیوتائیت کی طرف بڑھنے کا، دونوں جاننے اور سوچنے کی طاقت کے ساتھ ساتھ۔

اس چیلنج سے خوف زدہ لوگ جو جانوریت میں ڈوبنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ شدید

مغالطے میں ہیں۔ وہ حصہ جو شعور بن چکا ہے وہ لاشعور نہیں بن سکتا۔ کائنات کی اسکیم میں واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں۔

چیلنج قبول کرتے ہوئے لوگ جو سطح پر اچھے اور برے کے درمیان انتخاب کرتے ہیں وہ بھی شدید مغالطے میں ہیں۔ یہ انتخاب اور تبدیلی بھی قدرتی نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف کردار نگاری کی کوشش ہوسکتی ہے۔ اور جو کوشش ہے وہ اچھی نہیں مسائل جڑوں میں ہیں، سطح پر نہیں ہیں۔ جو سو رہے ہیں انہیں بیدار ہونا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ خراب کو چھوڑ کر لاشعور کو رہنے دیا جائے اندھیرے میں لیمپ جلایا جاتا ہے۔

میرا آج کا پیغام یہی ہے۔

61

دوپہر کا ٹھہراؤ۔ چمکتی ہوئی سورج کی روشنی اور نیم خوابیدہ درخت۔ میں آکر جامن کے درخت کی چھاؤں میں گھاس پر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھپر کبھی کبھی پتیاں گرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بیجان بوڑھی پتیاں ہیں۔

سارے درختوں پر نئی پتیاں آچکی ہیں۔ نئی پتیوں کے ساتھ انگنت پرندے بھی آئے ہیں۔ لگتا ہے نغمہ ریزیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کتنی قسم کے نغمے اس دوپہر موسیقی بنے ہیں۔ میں نے سنا۔ میں سنے جارہا ہوں اور پھر میں بھی ایک نرالی موسیقی کی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔

اپنی ذات کی دنیا بھی موسیقی کی دنیا ہے۔

یہ موسیقی ہر ایک شخص میں موجود ہے۔ اسے پیدا نہیں کرنا ہوتا۔ اس کو سننے کے لئے، ایک شخص کو صرف خاموش ہونا پڑتا ہے۔

اس لمحے جب ایک شخص خاموشی اختیار کرتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے پردہ ہٹ گیا ہو۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے اور ہمیشہ ہوتا ہے، وہ سنائی دینے لگتا ہے اور پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ ہم غریب نہیں ہیں۔ ہمیں بے انتہا دولت مل جاتی ہے۔ ایک شخص اس وقت کتنا ہنستا ہے۔ کہ وہ شخص جسکی وہ خواہش کررہا تھا، وہ تو اسکے پاس پہلے ہی بیٹھا ہوا ہے۔

62

رات میں بارش ہوئی تھی۔ سیلن ابھی تک قائم ہے اور زمین کی خوشبوں پھیلی ہوئی ہے۔ سورج اوپر آچکا ہے اور گائے کا ایک ریوڑ جنگلات کی جانب بڑھ رہا ہے۔ انکی گردنوں میں لکڑی کی کھنٹیاں خوبصورت آواز پیدا کررہی ہیں۔ تھوڑی دیر تک میں اسے سنتا رہا۔ اب گائیں کافی دور جاچکی ہیں اور اب بہت ہلکی آوازیں آرہی ہیں۔

اس دوران چند لوگ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لے آئے وہ پوچھ رہے ہیں۔ ''موت کیا چیز ہے؟''

میں کہتا ہوں۔ ''میں زندگی سے ناواقف ہوں، چنانچہ بس موت ہی ہے۔ اپنی ذات کو فراموش کرنا موت ہے ورنہ موت کا کوئی وجود نہیں، صرف ایک تبدیلی ہوتی ہے۔

اپنی ذات کو نہ پہنچانکر ہم نے خود کو واہمے اور فریب پر مبنی شخصیت بنالیا ہے اور ''میں'' خود پسندی کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ یہ وہاں ہے بھی نہیں صرف لگتا ہے کہ ہے۔ یہ صرف جھوٹی انفرادیت ہے جو ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہے۔ اس ٹوٹ پھوٹ سے کچھ اور پریشانیاں جنم لیتی ہیں کیونکہ ہم اسی سے پہنچانے جاتے ہیں۔

زندگی میں اس جھوٹ کو جاننا موت سے بچنا ہے۔ زندگی کو سمجھ لو تو موت کا اختتام ہوجائیگا۔ امر ہوجاؤگے۔ اس کو جاننا امر ہوجانا اور ابدیت پانا ہے۔ یہی مستقل اور حقیقی زندگی ہے۔

گزشتہ کل میں ایک ایسی ہی مٹنگ میں تھا۔

''خود اپنی ہستی کو پہنچاننا زندگی ہے۔
اپنی ہستی کو فراموش کرنا موت ہے۔''

63

ایک اسکول کا استاد ہے جو مذہب میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے اوقات مذہبی صحیفوں کے مطالعے میں گزارتا ہے۔ اگر کوئی شخص مذہب کے موضوع پر کوئی بات کہہ دے تو وہ نہ ختم ہونے والی گفتگو شروع کر دیگا۔ جیسے ایک طول طویل ڈوری جسکا کوئی سرا نہ ہو، اس کے خیالات بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بتانا انتہائی دشوار ہے کہ اسے کتنے حوالے اور اقوال یاد ہیں۔ کوئی بھی اس سے مرعوب ہوئے بنا نہیں رہتا۔ وہ ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہے یا پھر ایسا مشہور ہے۔ میں نے بارہا اسکے خیالات سنے ہیں لیکن ہمیشہ خاموش رہا۔

ایک بار اس نے مجھ سے اپنے بارے میں میری رائے جاننی چاہی۔ میں نے اسے سچ سچ بتا دیا۔ میں نے خدا کے بارے میں لب لباب بیان کیا کہ اس نے خدا کو گنوادیا۔ اسے شدید صدمہ پہنچا۔ کچھ دنوں بعد اس سوال سے متعلق گفتگو کے لئے وہ میرے پاس دوبارہ آیا۔ میرے پاس آکر کہنے لگا۔ ''صرف مطالعے اور استغراق کے ذریعے حقیقت تک پہنچا جاسکتا ہے۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ علم ہی سب کچھ ہے۔'' کتنے لوگ اس جھوٹے خیال کے اسیر نہیں ہیں؟

میں ایسے لوگوں سے صرف ایک ہی سوال کرتا ہوں۔ وہی سوال میں نے ان لوگوں سے کیا۔ ''مطالعہ کیا ہوتا ہے اور اسکے بعد کیا ہوتا ہے؟ کیا اس طرح تم میں کوئی نئی بصیرت جنم لیتی ہے؟ کیا شعور نئی بلندیوں اور سطح تک پہنچا ہے؟ کیا تمہاری زندگیوں میں انقلاب رونما ہوتا ہے؟ کیا تم جو کچھ اب ہو اس سے مختلف ہو جاتے ہو؟ یا پھر ویسے کے ویسے ہی رہ جاتے ہو سوائے اسکے کہ تمہاری یاد داشتوں میں مزید چند خیالات اور معلومات کا اضافہ ہو جاتا ہے؟

مطالعے کے ذریعے صرف یاداشت کی مشق ہوتی ہے جبکہ ذہن کی سطح پر خیالات کا کچھ اور غبار جم جاتا ہے۔ اسکے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے ہوسکتا ہے۔ کوئی مرکزی تبدیلی واقع نہیں ہوتی شعور ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ تجربات کے پہلو بھی ویسے ہی رہتے ہیں۔

سچائی اور حقیقت کے متعلق کچھ جاننا اور سچائی کو کاملاً جاننا دو مختلف چیزیں ہیں۔ سچائی

کے متعلق معلومات کا تعلق جاننے اور سوچنے کی طاقت (intellet) سے ہے جبکہ سچائی کو کاملاً جاننے کے لئے شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔

حقیقت اور سچائی کو جاننے کے لئے شعور کی مکمل بیداری لاشعور کی عدم موجودگی ضروری ہے۔ جبکہ یادداشت کی تربیت یا مشق اور نام نہاد علم سے اس تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

جس سے خود اپنی ذات کو نہ جان سکیں وہ علم نہیں ہے۔

سچائی کے متعلق علم وفہم (intellectual) کی معلومات انجانی سچائی اور صرف علم کی ظاہری صورت ہے۔ یہ جھوٹی بلکہ صحیح علم کے راستے کی رکاوٹ ہے۔

جانی ہوئی چیزوں کے ذریعے کوئی راستہ نہیں کہ انجانی چیزوں کو جانا جاسکے۔ یہ بالکل نیا ہے۔ ایسا نہیں کہ پہلے دیکھا گیا ہو۔ چنانچہ یادداشت کے ذریعہ یہ ممکن نہیں ہے بلکہ اسے پہنچانا تک۔ یادداشت صرف اسے پہنچان سکتی ہے جسے پہلے سے جانتی ہو۔ یہ صرف جانی ہوئی چیز دوبادہ جاننا ہے۔

لیکن نئی آمد کے بعد۔ قطعی نئی جسے سرے سے جانتے ہی نہ ہوں، نہ مانوس ہوں۔ یادداشت ایک طرف ہوجاتی ہے۔ یادداشت اور جانے پہنچانے خیالات ایک طرف ہوجاتے ہیں تاکہ نئی چیز تولد ہوسکے تاکہ نئے کو ویسا ہی جانا جاسکے جیسا کہ وہ ہے۔ اسکے ظہور کے بعد انسان کے تمام تصورات وغیرہ ایک طرف کھڑے ہوجاتے ہیں۔ صرف یادداشتوں، تصورات اور خیالات سے خالی ذہن ہی شعور اور بیداری ہے۔ صرف خالی ذہن سے ہی قلب ماہیت ہوتی ہے اور سچائی کا در کھلتا ہے۔ اس سے قبل ہر چیز جہاں پیائی اور زندگی کا زیان ہے۔

گزشتہ کل ایک راہب کہہ رہا تھا۔ ''میں نے تمام دنیاوی خواہشات کو چھوڑ دیا ہے۔ اب میری دلچسپی صرف حریت میں رہ گئی ہے صرف یہی آزادی ہے۔ دنیا سے دلچسپی حریت (liberation) سے گریز، حریت سے دلچسپی دنیا سے گریز ہے۔''

یہ بیان کتنا دانشمندانہ اور صحیح لگتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اس میں کہیں کوئی جھول نہیں اور یہ قطعی ذہن اور منطق کے مطابق ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بے معنی بھی ہے۔ ایسے الفاظ سے بہت سارے لوگ گمراہ ہوئے ہیں۔ جہاتک روحانیت کا تعلق ہے ذہن اور منطق کہیں لگا نہیں کھاتی۔ اس سے میں نے کہا۔ ''تم الفاظ کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہو۔ ''لفظی خواہشات'' کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہش بجائے خود ایک دنیا ہے۔ اسکا وجود دنیا ہے۔ چاہے وہ دنیا کی طرف ہو یا حریت (liberation) کی جانب۔ اسکی فطرت ایک جیسی ہے۔

خوہشات انسان کو اپنی ذات اپنے وجود سے دور لیجاتی ہیں۔ یہ جذبہ اور لگاؤ ہے۔ یہ کچھ حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ یہ ایک آرزو مندی ہے اور کچھ بننے کی دوڑ۔ A کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ B بن جائے یہ اسکی فطرت ہے۔ جب تک کچھ ہونے اور بننے کی خواہش ہو تو ''جو ہے'' وہ ظاہر نہیں ہوگا۔ اپنے وجود کو جاننا ہی حریت ہے

حریت کوئی ایسی چیز نہیں جو پائی جائے۔ یہ خواہش کی تجسیم (object) نہیں چنانچہ اسکی خواہش نہیں کی جاسکتی۔ یہ اس وقت وقوع پزیر ہوتی ہے جب ساری خواہشیں ختم ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ حریت کی۔ پھر ''جو ہے'' اسے حریت کہتے ہیں۔ چنانچہ حریت نہیں حاصل ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام حاصل اشیاء چھوڑ دیتے ہیں، اس وقت آزادی اور حریت (libration) ملتی ہے۔

انسان جسے کائنات کہتا ہے اس کے وجود کی حد نہیں یہ صرف انسان کے حواس اور احساس کی حد ہوتی ہے۔ اس حواس کے باہر بے حد وحساب وسعت ہے۔ اسکی کوئی حد نہیں۔ اس وسعت کو مکمل طور پر حواس مین نہیں سمایا جاسکتا کیونکہ حواس تو صرف ایک حصہ کا ہی مشاہدہ کرتا ہے۔ صرف ایک ٹکڑے کا۔ اور جسکی کوئی حد ہی نہ ہو، وہ لامحدود ہو، اسکے ٹکڑے اور حصے بھی نہیں کیئے جاسکتے۔ لامحدود کی پیائش اسی سے ہوسکتی ہے جو لامحدود ہو۔

اور وہ لوگ جو اسے جانتے ہیں انہیں یہ وسعت انکے حواس اور جاننے اور سوچنے کی طاقت کے ذریعے نہیں معلوم ہوئی، انہوں نے خود کو لامحدود کر کے جانا ہے۔

یہ ممکن ہے کیونکہ بظاہر معمولی اور محدود شخص دکھائی دینے والے میں لامحدودیت بھی موجود ہے۔ آدمی حواس سے آگے ختم نہیں ہوجاتا نہ ہی وہ حواس تک محدود ہے۔ وہ حواس سے پرے بھی مختلف پہلوؤں سے پھیلا ہوا ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اسکا نقطۂ آغاز ہے۔ اسکی انتہا نہیں۔ وہ مخفی ہے۔ دکھائی دینے والے کے دائرے میں مخفی بیٹھا ہوا ہے۔

جو شخص اپنے اندر چھپے ہوئے کو پہنچان لے وہ پوری کائنات کو دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ تمام حصوں اور ٹکڑوں کا تعلق اس سے ہے جو دکھائی دیتا ہے جبکہ چھپا ہوا یا مخفی حصوں اور ٹکڑوں میں نہیں ہے۔ ایک اور بہت سے، ایک ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک کو پاتے ہیں تو سب ہی مل جاتا ہے۔ مہاویرا نے کہا ہے جو ایک صاحب بصیرت اور ناظر ہے۔ چنانچہ اسکو پانے کا ذریعہ آنکھ نہیں بلکہ آنکھیں بند ہوں تو راستہ ملتا ہے۔ ''آنکھیں۔ اگر آنکھیں بند ہونے کے باوجود انکے سامنے دکھائی دینے والی چیزیں نہیں رہیں تو سمجھ لو کہ بند آنکھیں ویسی ہی ہیں جیسے کھلی ہوئی آنکھیں۔ اگر دکھائی دینے والی چیزیں نہ دکھائی دے رہی ہوں تو آنکھیں کھولی بھی جاسکتی ہیں لیکن وہ ویسی ہی ہونگی جیسی بند آنکھیں۔ جب کچھ نہ دکھائی دے رہا ہو تو ناظر دکھائی دینے لگے گا۔

وہ مشاہدہ جسمیں ناظر دکھائی دے وہی اصل مشاہدہ ہے۔ جب تک صحیح مشاہدہ نہ ہو، انسان اندھا ہے۔ آنکھوں کے ہوتے بینائی سے محروم۔ بینائی اس وقت ہوتی ہے جب مشاہدہ صحیح ہو۔ حقیقی آنکھیں۔ وہ آنکھ جو حواس سے ماورا ہو۔ پھر حدود ختم ہو جاتی ہیں، حصوں اور ٹکڑوں کی لائنیں نہیں رہتیں، اور وہ جو ہے۔ شروعات سے خالی اور نہ ختم ہونے

والی وسعت، برہمن مل جاتا ہے۔

یہی حصول حریت ہے کیونکہ تمام حدود غلامی نہیں، ہر حد محتاجی ہے۔ حد کو پار کرنا آزاد ہونا ہے۔

66

گزشتہ روز میں نے ایک گفتگو سنی۔ اسکا محور یا موضوع خود اپنے کسی عمل کو روکنا تھا۔ یہ ایک مقبول روائت ہے۔ اس خیال کے مطابق ایک شخص کو ہر ایک سے محبت لیکن خود اپنے آپ سے نفرت کرنی چاہیئے۔ ایک شخص کو خود اپنی ذات سے دشمنی کرنی چاہیئے۔ اس طرح خود پر فتح نصیب ہوتی ہے۔ یہ تصور اتنا ہی غلط ہے جتنا مقبول ہے۔ اس راستے پر ایک شخص کی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اور اس شخص کی مصیبتوں کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اور مصیبتوں سے ہر چیز گھناؤنی ہو جاتی ہے۔

انسان کو اس طرح اپنے جذبات دبانا نہیں چاہیئے اور یہ ممکن بھی نہیں۔ تشدد کا راستہ مذہبی راستہ نہیں ہوتا۔ بہرحال اسکے نتیجے میں اپنے جسم کو اذیت دینے کے بہت سے طریقے پروان چڑھ گئے۔ وہ اذیت گناہ کا کفارہ لگتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایذا رسانی سے لطف لینا ہے۔ یہ گناہوں کا کفارہ نہیں، خود فریبی ہے۔

انسان کو اپنے ساتھ جنگ نہیں بلکہ خود کو پہچاننا ہے۔

لیکن خود کو جاننے کی ابتدا تو اپنے آپ سے محبت سے شروع ہوتی ہے۔

ایک شخص کو اپنے آپ سے محبت صحیح انداز میں کرنی چاہیئے ایسے لوگ جو اپنے جذبات کے اندھے مقلد ہوتے ہیں اپنے آپ سے محبت نہیں کرتے نہ ایسے لوگ جو آنکھ بند کر کے خود کو اذیّت دیتے ہیں۔ دونوں ہی اندھے ہیں۔ دوسرا اندھا پن اول الذکر کے ردعمل میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص جذبات میں خود کو تباہ کر لیتا ہے، دوسرا خود سے جنگ کرتا ہے دونوں ہی خود سے نفرت اور بیزاری کا عمل کرتے ہیں۔

علم کی ابتدا خود اپنی محبت سے شروع ہوتی ہے۔ ہم جو کچھ اور جیسے ہیں اسے تسلیم کرنا اور محبت کرنا ہے۔ خود اپنے آپ کو تسلیم کرنے اور محبت کرنے سے وہ روشنی فراہم ہوتی ہے جس سے سب کچھ قدرتی طور پر تبدیل ہو جاتا ہے اور اس شخص میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک موسیقی، ایک سکون، ایک مسرت ان تمام چیزوں کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اسے روحانی زندگی کہا جاتا ہے۔

میں پہنچا تو وہاں سچائی اور صداقت پر گفتگو ہو رہی تھی میں نے اسے سنا۔ گفتگو کرنے والے لوگ پُر مطالعہ تھے۔ وہ فلسفے سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ کتنے قسم کے نظریات ہیں۔ کتنے قسم کے نقطہ نظر۔ لگتا تھا وہ سب سے واقف ہیں۔ انکے دماغ بھرے ہوئے تھے، سچائی اور حقیقت سے نہیں بلکہ اس بات سے کہ لوگوں نے سچائی کے متعلق کیا کہا ہے۔ جیسے کہ سچائی کو اس بنیاد پر جانا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے اسکے متعلق کیا کہا ہے۔ جیسے کہ سچائی ایک نقطہ نظر ہے، ایک خیال یا ذہانت پر مبنی منطقی استدلال کا خلاصہ۔ انکی بحث کافی بڑھ گئی اور اب یہ صورت حال ہو گئی کہ کوئی کسی کو نہیں سن رہا تھا۔ ہر شخص بات تو کر رہا تھا لیکن کوئی سن نہیں رہا تھا۔

میں خاموش ہوں۔ پھر کسی نے مجھے پہچان لیا، اور سب لوگوں نے میری رائے بھی پوچھی۔ میری کوئی رائے نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جہاں نظریہ ہے وہاں سچائی نہیں۔ سچائی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں خیالات ختم ہوتے ہیں۔

مجھے کیا کہنا چاہئے۔ سب لوگ سننا چاہتے ہیں۔ میں انہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔

چھٹی صدی عیسوی کا ایک صوفی چین گیا۔ وہاں اسنے چند سال قیام کیا، اسکے بعد واپس آکر اپنے شاگردوں میں بیٹھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے شاگرد سچائی کی تلاش میں کہاں تک آگے بڑھے ہیں۔ اسکے سوال کے جواب میں ایک شاگرد نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ حقیقت اور سچائی تسلیم کرنے اور نہ تسلیم کرنے سے آگے ہے۔ نہ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہے، نہ یہ کہ نہیں ہے۔ کیونکہ اسکی فطرت ہی ایسی ہے۔''

''یہ میری جلد ہے جو تم لئے ہوئے ہو۔'' دوسرے شاگرد نے کہا۔ ''جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، سچائی اندرونی بصیرت کا نام ہے۔ اگر ایک بار مل جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے مل جاتی ہے وہ ضائع نہیں ہوتی۔''

بدھ صوفی نے کہا۔ ''یہ میری ہڈیاں ہیں جو تمہارے پاس ہیں۔''

بالآخر وہ شخص جو سمجھتا تھا کھڑا ہوا، اسنے اپنا سر استاد کے قدموں پر رکھا لیکن خاموش رہا۔ وہ خاموش تھا اور اسکی آنکھیں خالی تھیں۔

بدھ صوفی نے کہا۔ ''یہ میرا جوہر، میری روح ہے جو تمہارے پاس ہے۔''

یہی کہانی بجائے خود میرا جواب ہے۔

میں ایک مندر میں تقریر کرنے گیا۔ تقریر کے بعد ایک جوان شخص نے کہا۔ ''کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں؟ یہ سوال میں نے بہت سے لوگوں سے کیا لیکن کسی جواب نے بھی متاثر نہیں کیا۔ ہر فلسفے میں یہ بات ہے۔ ''خود کو پہچانو۔'' میں بھی خود اپنے آپ کو جاننا چاہتا ہوں اور یہی میرا سوال ہے کہ میں کون ہوں؟ '' مجھے اسی سوال کا جواب مطلوب ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے ابھی تک سوال نہیں کیا پھر جواب کیسے ملے گا؟ سوال کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا؟''

تھوڑی دیر تک جوان شخص مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ یہ بات واضح تھی کہ وہ میرے بیان میں موجود اشارے کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم یہ کہتے ہو کہ میں نے ابھی تک سوال ہی نہیں کیا؟''

میں نے اس سے کہا۔ ''رات میں میرے پاس آنا۔'' وہ اس رات میرے پاس آیا۔ شاید اس نے سوچ رکھا تھا کہ میں اسے کوئی جواب دونگا۔ میں نے اسے ایک جواب دیا لیکن میرے دئے ہوئے جواب کو وہ نہیں سمجھ پایا۔

وہ آیا اور ابھی بیٹھا ہی تھا کہ میں نے روشنی گل کر دی۔ اسنے کہا۔ ''تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم اندھیرے میں جواب دیا کرتے ہو؟'' میں جواب نہیں دے رہا ہوں، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سوال کس طرح کرتے ہیں۔ روحانی زندگی اور سچائی کے متعلق جواب باہر سے نہیں ہوا کرتا۔ علم بیرونی حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ کوئی اطلاع اور معلومات نہیں ہوتیں۔ چنانچہ انہیں تمہارے اندر باہر سے نہیں ٹھونسا جاسکتا۔ اسے اندر سے برآمد کیا جاتا ہے۔ ویسے ہی جیسے کنویں سے پانی نکالتے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ وہاں موجود ہوتا ہے۔ ہمیں صرف اپنی بالٹی اسمیں ڈالنی ہوتی ہے۔ اس عمل میں صرف ایک بات یاد رکھنے والی ہے کہ جب کنویں میں بالٹی ڈالیں تو وہ خالی ہو۔ اگر بالٹی یا پانی کا برتن خالی ہوگا تو وہ بھر کے نکلے گا۔ اور ایک شخص کو پانی مل جائے گا۔''

تاریکی اور خاموشی میں کچھ وقت گزر گیا۔ اس کے بعد اسنے کہا۔ ''اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

میں نے جواب دیا۔''بالٹی کو خالی کرو ، خاموش رہواور پوچھو''میں کون ہوں ؟''پوچھوایک بار دوبارتین بار اور اپنی پوری قوت سے پوچھوکہ میں کون ہوں؟ یہ سوال اس طرح کرنا چاہیئے کہ اسکی بازگشت لگا تار موسیقی کے پیانے میں تمہارے پورے وجود سے نکل رہی ہو اور پھر خاموشی اختیار کرتے ہوئے ، خیالات سے آزاد رہکر انتظار کرو ۔ سوال پھر خاموشی اور خالی پن اور انتظار ۔بس یہ طریقہ کار ہے۔

اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔''میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوال کیا لیکن خاموشی سے انتظار ممکن نہیں ہے۔ اور اب میں سمجھ پایا ہوں کہ میں نے آج تک سوال ہی نہیں کیا۔''

69

میں ایک مضمون پڑھ رہا ہوں ، یہ کسی نہایت نیک شخص کا لکھا ہوا ہے ۔ اس نے لوگوں پر زور دیا ہے کہ غصہ چھوڑ دو، دنیا سے لگاؤ ختم کردو ، جذبات کو بھول جاؤ ۔ جیسے کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک شخص کو اسے ہلانا ہے اور پھر نکال کر پھینک دینا ہے۔ پڑھنے اور سننے سے یہی تاثر ملتا ہے۔

ایسے وعظ کو سنکر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے کہ ہماری جہالت کتنی گھمبیر ہے اور ہم انسانی ذہن کو کتنا کم جانتے ہیں۔

میں نے ایک دن ایک بچے سے کہا تھا۔ تم اپنی بیماری کو اٹھا کر پھینک کیوں نہیں دیتے ؟''لڑکا ہنستے ہوئے کہنے لگا۔'' کیا یہ میرے قبضہ قدرت میں ہے کہ میں اسے اٹھا کر پھینک دوں؟''

ہر شخص بیماریوں اور بری چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا چاہتا ہے ۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان خرابیوں کی جڑوں میں اندر تک ڈوبا جائے اور لاشعور کی گہرائی میں اترا جائے جہاں وہ ظاہر ہوتی ہیں ۔ کوئی شخص اس سے اس طرح چھٹکارا نہیں پا سکتا کہ اپنے شعور میں اس عزم کا ارادہ کرلے ۔

فرائڈ نے ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے۔ ایک دیہاتی ،شہر کے ایک ہوٹل میں قیام پزیر ہے۔ رات میں وہ کمرے کی لائٹ بند کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن لائٹ یونہی جلتی رہتی ہے۔ دوسری صبح اس نے ہوٹل انتظامیہ سے اس بات کی شکایت کی۔ شکایت کے جواب میں اسے معلوم ہوا کہ وہ روشنی ، روائتی لیمپ کی نہیں ہے بلکہ بجلی کی روشنی ہے جسے جلایا ، بجھایا جاسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان سے یہ کہنا کہ وہ اپنے جذبات اپنی محسوسات کو ختم کردے ، یہ طریقہ کار غلط ہے ۔ وہ مٹی کے تیل کا لیمپ نہیں ہیں جسے پھونک مار کر بجھایا جا سکے ۔ وہ الیکٹرک لیمپ ہیں۔ اسے بجھانے کا طریقہ لاشعور میں پنہاں ہے۔

شعوری ذہن کی تمام باتیں بیکار ہیں جیسے الیکٹرک لیمپ کو پھونکوں سے بجھایا جائے تا وقت کہ کسی مناسب طریقے سے لاشعور میں اتر کر اسکی جڑیں نہ کاٹ دی جائیں۔

70

ٹک ، ٹک ، ٹک، گھڑی پھر چلنی شروع ہوگئی ۔ حقیقت یہ ہے کہ گھڑی مسلسل چلتی رہتی ہے، صرف میرے لئے رکی ہوئی تھی ۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم خود اس سے قریب ہوگئے جہاں یہ چل رہی ہے۔ میں کسی دوسرے وقت کی حدود میں پہنچ گیا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھا اپنے اندر دیکھ رہا تھا، اور دیکھتا رہا۔ یہ وقت کی دوسری ہی حدود تھیں ۔ پھر ان حدود سے رابطہ منقطع ہوگیا۔

میں وقت کی دوسری حد میں پہنچ گیا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھا ہوا تھا اور اپنے اندر دیکھ رہا تھا اور دیکھتا رہا، یہ وقت کی ایک بالکل ہی مختلف حد تھی ۔ اسکے بعد وقت کی اس حد سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ وقت کی حدود سے باہر پہنچنا کتنا دلفریب ہے۔ ذہن میں موجود تمام مناظر رک گئے ۔ اسکی موجودگی وقت کی بناء پر ہی تھی ۔ وقت نہ ہو تو صرف حال رہ جاتا ہے حال زبان دانی میں وقت کا حصہ ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت کی حدود کے باہر ہے اس میں جانے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اندر جایا جائے ۔ اب میں اس دنیا سے واپس آ گیا ہوں۔ ہر چیز کتنی پرسکون ہے، دور چند پرندے چہچہا رہے ہیں، گا رہے ہیں۔ کہیں پڑوس میں ایک بچہ رو رہا ہے اور ایک مرغا بول (اذان) رہا ہے۔

یہاں موجود ہونا کتنا دل خوش کن ہے اور مجھے اب یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ موت بھی کتنی مسرت آگیں ہوتی ہے کیونکہ اس سے زندگی کا اختتام نہیں ہوتا۔ زندگی صرف ایک کیفیت ہے۔ اس کے سامنے زندگی ہے بعد میں بھی۔

71

خدا کیا ہے؟

کتنے ذہنوں میں یہ سوال موجود ہے؟ گزشتہ روز ایک جوان شخص نے مجھ سے پوچھا۔ اور یہ سوال پوچھا جیسے خدا بھی کوئی چیز ہے (نعوذ باللہ) طالب سے مختلف اور الگ ۔ اور یہ کہ کیا اسے دوسری چیزوں کی طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ خیال کہ خدا کو حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ ایک فضول سوچ ہے۔ اور یہ نظریہ کیا اسے سمجھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے وجود کے ہر ہر حصے میں موجود ہے۔ اسے مزید وضاحت سے یوں کہہ سکتے ہیں۔ ''میں'' نہیں ،صرف وہی ہے۔

خدا اس کا نام ہے۔ ''جو کہ موجود ہے۔'' وہ وجود میں کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ کسی ہستی کی صورت میں نہیں بلکہ دوسرے وجود اس میں ہیں۔ وہ ایسا نام ہے جو بے نام ہے۔

اسی لئے وہ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ طالب اسکے اندر موجود ہے۔

ایک شخص صرف اسے اپنے اندر سے کھوسکتا ہے۔

اور اسے گم کرنے کا مطلب پانا ہے۔

ایک کہانی ہے۔ ایک مچھلی سمندر کا بار بار نام سن کر اکتا گئی تھی۔ ایک دن اسنے مچھلیوں کی ملکہ سے پوچھا۔ ''میں بہت دنوں سے سمندر کا نام سن رہی ہوں ۔ آخر یہ سمندر ہوتا کیا ہے؟ اور وہ ہے کہاں ؟ ملکہ نے جواب دیا۔ ''تمہاری پیدائش سمند کی ہے۔ تمہاری زندگی ،تمہاری دنیا سمندر ہی ہے۔ گویا تم خود سمندر ہو۔ سمندر تمہارے اندر ہے اور تمہارے بناء بھی سمندر ہے۔ تمہاری تعمیر سمندر میں ہوئی اور تمہارا اختتام بھی اسی میں ہے۔ ہر لحہ سمندر تمہارے چاروں طرف ہے۔''

خدا ہر ایک شخص کے چاروں جانب ہے لیکن ہم چونکہ بے شعور ہیں اس لئے اسے نہیں دیکھتے۔

لاشعور دنیا ہے جبکہ شعور ہو تو خدا۔

72

ایک درویش آیا، وہ بہت دنوں سے سنیاسی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے سنیاس کیوں لیا؟'' اسنے کہا۔ ''مجھے سکون کی خواہش تھی۔''

اس پر میں نے سوچا۔ ''کیا سکون کی خواہش ہو سکتی ہے؟ کیا سکون اور خواہش دونوں متضاد چیزیں نہیں ہیں؟ میں نے اس سے پوچھا۔

وہ مشکل میں پڑ گیا اور کہا۔ ''پھر میں کیا کروں؟'' میں نے ہنسنا شروع کر دیا اور کہا۔ ''کیا اسے کرنے میں خواہش نہیں پنہاں؟

سوال کچھ کرنے سے نہیں۔ سکون کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا یہ خواہش کا حصہ نہیں۔ اسکی خواہش فضول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جاننا ہے۔ صحیفوں کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے وجود سے کیونکہ صحیفوں کی طرف جانے سے ہی سکون کی خواہش ہوتی ہے چنانچہ یہ سوال کہ ''کیا کرنا چاہئے'' پیدا ہوتا ہے۔

درویش نے کہا۔ ''بے چینی بے اطمینانی جذبات کی بناء ہوتی ہے، خواہش کی وجہ سے اگر خواہش ختم ہو جائے تو سکون ہی سکون ہو۔

میں نے کہا۔ ''یہ جواب صحیفوں کا ہے، تمہارا اپنا نہیں، ورنہ اسکا اظہار ممکن نہ ہوتا کہ ''میری خواہش سکون کی ہے۔'' اگر خواہش بے اطمینانی ہے تو پھر سکون کی خواہش کیسی؟ بے چینی کو سمجھو۔ اسے ذاتی تجربے کے ذریعے بیدار کرو۔ اسے معصوم اور بے تعصب ذہن کے ذریعے سمجھو۔ اس کو سمجھنے سے بے چینی کی جڑیں تمہارے سامنے آ جائیں گی۔ جذبات بے چینی کی جڑیں ہیں۔ اسے تم دیکھ سکو گے۔ اور اس بصیرت سے بے چینی غائب ہو جائیگی۔''

بے چینی سے آگاہی، اسکی موت ہے۔ اسکی زندگی تاریکی اور بصارت سے محرومی کی وجہ سے ممکن ہے۔ آگاہی کی روشنی آتے ہی اسکی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ بے چینی کے ختم ہونے کے بعد کیا بچتا ہے سکون۔

سکون کی خواہش بے چینی کی جگہ نہیں ہوتی۔ سکون بے چینی کی ضد نہیں بلکہ بے چینی کی عدم موجودگی ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو سکون کا طالب نہیں بلکہ صرف بے چینی کو جاننا اور سمجھنا چاہئے صحیفوں سے حاصل کردہ علم بے چینی سے آگاہی کے راستے نہیں ایک رکاوٹ

ہے۔ کیونکہ ریڈی میڈ جوابات ذہن کو پر کر دیں گے اس سے قبل کہ ایک شخص تجربات سے گزرے۔ مانگے کے علم سے تالیف قلب نہیں ہوتی۔ ذاتی تجربہ صحیح راستہ ہے۔ اپنی روحانی زندگی میں ہر ایک شخص کو اپنے راستے کا انتخاب کرنا چاہئے اس طرح کہ مانگے کے علم کا بوجھ اتار پھینکے۔

انسان کو کیا ہوا؟

میں صبح کو اٹھا۔ دیکھتا ہوں کہ گلہریاں دوڑتی پھر رہی ہیں میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ سورج کی کرنوں میں پھول کھل رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی نظر آتا ہے کہ قدرتی مناظر سے پیا رومحبت کے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ میں رات میں بستر پر جاتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ستا روں سے خاموشی کے فوارے جاری ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مخلوقات پر سکون نیند کی آغوش میں ہیں۔ پھر میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ ''انسان کو کیا ہوا؟''

ہر چیز مسرت سے سرشار ہے، سوائے آدمی کے ہر ایک چیز موسیقی سے مرتعش ہے سوائے انسان کے ہر ایک شخص زبانی سکون سے مطمئن ہے سوائے بندے کے۔

کیا انسان ان سب چیزوں میں شریک نہیں ہے؟ کیا آدمی کوئی باہری شخصیت ہے، اجنبی؟ یہ اجنبیت اس نے خود اپنے ہاتھوں پیدا کی ہے۔ یہ علیحدگی خود اس نے اختیار کی ہوئی ہے۔

مجھے بائیبل کی کہانی یاد آتی ہے۔ پھل کھانے کے بعد آدمی جنت سے نکالا گیا۔ یہ کہانی کتنی صحیح ہے علم، ذہانت، دماغ نے آدمی کو زندگی سے توڑ دیا۔ جو کچھ بچا تھا اس سے وہ نکل گیا۔

تھوڑا سا علم، تھوڑا سا ذہن اور پھر نئی دنیا کی دریافت اس میں ہم فطرت کے ساتھ ملکر ایک ہوجاتے ہیں۔ وہاں الگ کوئی چیز نہیں اور نہ مختلف ہے۔ سب باہم ملکر سکون اور اطمینان کی موسیقی میں رچ بس جاتے ہیں۔

صرف یہی تجربہ ''خدا'' ہے۔

خدا کوئی فرد نہیں، وہ کوئی تجربہ نہیں بلکہ خود تجربے کو خدا کہتے ہیں۔ خدا آمنے سامنے دکھائی نہیں دیتا بلکہ اسے براہ راست دیکھنے کو خدا کہتے ہیں۔ اس طرح براہ راست دیکھنے میں انسان قوی اور مجسم ہوجاتا ہے۔ اس تجربے میں وہ گھر آتا ہے اور اس روشنی میں درختوں، پھولوں کی قدرتی خوشبوؤں کا حصہ دار ہوجاتا ہے۔ ان سب میں وہ ایک انتہا میں چھپ کر دوسری میں "isness" حاصل کرلیتا ہے۔

یہ اسکی موت اور ساتھ ساتھ دوسرا جنم ہے۔

کوئی پوچھ رہا تھا۔ ''آتما'' روح کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ برہما کیسے حاصل کرتے ہیں۔؟''

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، روح کے حصول کا خیال غلط ہے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے حاصل کیا جاسکے۔ یہ تو پہلے ہی حاصل ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے اندر لایا جاسکے۔ یہ کوئی مقصود نہیں جسے تسلیم کیا جائے۔ ایسا بھی نہیں کہ مستقبل میں کوئی شخص اس تک پہنچے۔ یہ حال ہے، ہمیشگی کے ساتھ حال۔ اس میں نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل۔ یہ بننے والی کوئی چیز نہیں نہ اسے گنوانا ممکن ہے نہ اسے حاصل کرنے کا کوئی معنی مطلب ہے۔ یہ خالص ابدیت کے ساتھ موجود ہے۔

پھر کس سطح پر اسکے ظائع ہونے کا امکان ہے؟ پھر اسکے ظائع ہونے اور حاصل کرنے کی پیاس کہاں سے آگئی؟

اگر ایک شخص یہ سمجھ لے کہ ''میں'' کیا ہے پھر روح کے ختم ہونے۔۔۔ جو حقیقتاً ضائع نہیں ہوسکتی۔ تو ''میں'' کو سمجھ سکتا ہے۔ ''میں'' روح نہیں ہوتی، نہ ہی ''وجود'' اور نہ ''دوسرے'' روح ہوتی ہے۔ اسے دہری حیثیت دنیا خیالی ہے، ذہنی اختراع۔

ذہن بظاہر انفرادی ہے۔ یہ حال میں نہیں ہوتا۔ یہ یا تو ماضی میں ہے یا مستقبل میں اور دونوں ہی کا کوئی وجود نہیں۔ ایک پہلے ہی بے وجود بن چکا دوسرا ابھی تک وجود میں آیا ہی نہیں۔ ایک ہماری یادداشت میں ہے دوسرا ہمارے تصور میں لیکن دونوں ہی لاموجود ہیں۔ اسی لاموجودیت سے ''میں'' پیدا ہوا۔

''میں'' خیالات کی پیداوار ہے۔ وقت بھی خیالات ہی کی پیداوار ہے۔ خیالات اور ''میں'' کے درمیان روح پوشیدہ ہے۔ یہ ہے لیکن نظر آتی ہے کہ ظائع ہوگئی۔ پھر یہی ''میں'' اور خیالات کا بہاؤ نام نہاد ظائع ہونے والی روح کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ یہ تلاش ناممکن ہے کیونکہ اسی تلاش کے باعث ''میں'' اور زیادہ قوی اور طاقتور ہوجاتا ہے۔

''میں'' کے ذریعے روح کی تلاش ایسے ہی ہے جیسے بیداری کو خواب کے ذریعے تلاش کیا جائے۔ ایک شخص اسے حاصل تو کرسکتا ہے لیکن ''میں'' کے ذریعے نہیں بلکہ ''میں'' کی گمشدگی یا غیرموجوگی میں۔ جب خواب ٹوٹتا ہے تو بیداری ہوتی ہے اور جب

''میں'' ناموجود ہوتو روح ۔ روح ، عدم وجود یا لاوجود ہے کیونکہ اسمیں پوراپن یا سالمیت ہے۔ وہاں کوئی ''وجود'' اور دوسری شے نہیں ۔ اسمیں دہراپن (non dual) نہیں ۔ یہ وقت سے بھی ماورا ہے۔ اس لمحے جب خیالات نہ ہوں اور ذہن چھپ جائے تو یہ دریافت ہوجاتی ہے کیونکہ روح کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اسلئے اسکی جستجو کی ضرورت نہیں۔

جستجو اور جستجو کرنے والے کو چھوڑنا ہے ۔جب جستجو اور جستجو کرنے والے کو چھوڑ دیا جائے تو تلاش مکمل ہوجاتی ہے۔ ''میں'' کی نفی کے بعد وہ حاصل ہوجاتی ہے۔

75

تقدس کیا ہے؟

بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا تقدس کے لئے کسی خاص قسم کے لباس ، بیرونی ہیئت اور صورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقتاً تقدس کے لئے بیرونی ہیئت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ یہ کچھ اندرونی حقیقت ہے۔ اور اندرونی حقیقت کیا ہوتی ہے؟

تقدس ایک شخص کے وجود میں ہوتا ہے ۔ عام طور پر آدمی اپنے وجود سے باہر ہوتا ہے، وجود کے اندر ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہوتا ۔ وہ ہر ایک شخص کے ساتھ تو ہوتا ہے لیکن اپنی ذات کے ساتھ نہین ہوتا۔ اور خود سے یہی علیحدگی تقدس ہے۔ اپنی ذات میں واپس آنا ، خود کے اندر جڑ پکڑنا تقدس ہے۔ روحانی غیر صحت مندی غیر تقدس ہے جبکہ روحانی صحت تقدس۔

اگر میں خود سے باہر ہوں تو میں سویا ہوا ہوں بیرونی ''دوسرا'' ہے، لاشعوری۔ مہادیرا نے کہا ہے۔ ''وہ جو سوتا ہے وہ اتھلا ہے۔ ''دوسرے'' کی انحصاری سے بیدار ہونا ''ذات کا تقدس ہے۔''

اس تقدس کو کس طرح پہچانا جائے؟

اس تقدس کو سکون ، مسرت اور مکمل ہونے کے احساس سے پہچانتے ہیں۔

ایک برگزیدہ شخصیت تھی۔ سینٹ فرینسس۔ وہ اپنے شاگرد لیو (leo) کے ساتھ مقدس مقام کی زیارت پر تھا۔ وہ san marino جارہے تھے کہ راستے میں طوفانی بارش کا سامنا ہوگیا وہ دونوں مکمل طور پر بھیگ اور کیچڑ مٹی میں لت پھت ہوگئے ۔ رات ہونے والی تھی ، سارے دن کی بھوک پیاس اور سفر کی تھکاوٹ نے انہیں بے حال کر رکھا تھا۔ گاؤں اب بھی کافی دور تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نصف شب سے قبل وہاں پہنچ جائیں۔ یکا یک سینٹ فرینسس نے کہا۔ ''لیو حقیقی مقدس کون ہے؟ وہ نہیں جو اپنی آنکھیں اندھے کو دیدے جو بیماروں کو نہ صرف صحت دے سکتا ہو بلکہ مردے کو کھڑا کر سکتا ہو۔ وہ حقیقی برگزیدہ شخص نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی ، پھر فرینسس دوبارہ گویا ہوا۔ ''لیو برگزیدہ وہ بھی نہیں،

ہے جو چرند پرند، پیڑوں، پتھروں اور چٹانوں کی زبان سمجھتا ہو۔ وہ بھی نہیں جس نے پوری دنیا کا علم حاصل کرلیا ہو۔“

تھوڑی دیر تک دوبارہ خاموشی طاری رہی۔ وہ دونوں شدید بارش میں آگے بڑھتے رہے۔ اب san marino کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سینٹ فرینسس نے پھر کہا۔ ”وہ بھی نہیں جو سب کچھ ترک کردے۔“

اب لیو خاموش نہ رہ سکا۔ اسنے پوچھا۔ ”تو پھر حقیقی برگزیدہ کون ہے؟“

سینٹ فرینسس نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ سین میرینو پہنچنے والے ہیں۔ وہاں سرائے کے باہری دروازے پر دستک دینگے۔ چوکیدار پوچھے گا ”کون ہے؟“ ہم جواب دیں گے۔ ”تمہارے اپنے دو بھائی۔ دو درویش وہ کہے گا۔ ”تم فقیر، بدبخت، بھکاری، بھاگ جاؤ۔ تم جیسے لوگوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر وہ دروازہ کھولنے سے انکار کردیتا ہے تو ہم اسی طرح بھوکے پیاسے تھکے ہوئے، کیچڑ مٹی میں لت پت، آدھی رات میں کھلے آسمان تلے رکنے پر مجبور ہوں گے پھر ہم دوبارہ دستک دیں گے۔ اس بار وہ باہر آئے گا اور لکڑی سے ہمیں مارے گا ”تم لچے بدمعاش ہمارے آرام میں خلل نہ ڈالو۔ اگر اس موقعے پر بھی ہمارے اندر کوئی تبدیلی نہیں آتی اگر ہمارے اندر سب کچھ پرسکون رہتا ہے، خاموش اور خالی اور ہم اس سرائے والے کو اسی طرح دیکھتے رہیں جیسے دیوتا کو دیکھتے ہیں۔ تو یہ حقیقی تقدس ہوگا۔“

بے شک ہر طرح کے موقعے پر پرسکون سادہ اور متحمل رہنا تقدس ہے۔

76

گزشتہ شب ایک شخص نے پوچھا۔ ”میں اپنی سوچ سے لڑ رہا ہوں لیکن سکون حاصل کرنے میں ناکام ہوں۔ مجھے اپنے دماغ کے ساتھ کیا کرنا چاہئے تاکہ میں سکون پاسکوں؟“

میں نے کہا۔ ”تاریکی کے ساتھ کوئی کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ یہ کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ تو روشنی کی عدم موجودگی ہے۔ اسلئے اس کے خلاف جنگ بے معنی ہے۔ ایسا ہی ذہن کے ساتھ ہے۔ اسکا بجائے خود کوئی وجود نہیں۔ یہ اپنی ذات کی پہچان نہ ہونا ہے۔ اسلئے اس کے ساتھ بھی براہ راست کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی کو تاریکی دور کرنی ہے تو اسے روشنی لانی ہوگی۔ بالکل ویسے ہی اگر ذہن اور خیالات سے چھٹکارا پانا ہو تو مراقبہ کیا جانا چاہئے۔ دماغ کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔ بس صرف اس بات سے آگاہ ہونا ہے کہ اسکا تو وجود ہی نہیں۔ اسی لمحے جب اس حقیقت کو تسلیم کیا جائیگا، اُس سے نجات مل جائے گی۔

اس نے پوچھا ”اسے کیسے تسلیم کیا جائے؟“

یہ اس وقت تسلیم ہوتی ہے جب شعور بیدار ہوتا ہے۔ ذہن کے گواہ بن جاؤ، جو ہے اس کے گواہ بن جاؤ۔ اس وسوسے کو نکال دو کہ یہ کیسے ہوگا۔ جو ہے، اسے ویسے ہی بیدار کرو۔ اس بارے میں چوکس ہوجاؤ۔ فیصلہ کرنے کے لئے منصف نہ بنو، اسے کنٹرول نہ کرو، کسی قسم کی جدوجہد نہ کرو۔ صرف خاموشی سے دیکھو یہ مشاہدہ یہ گواہی بجائے خود آزادی ہے حریت ہے۔

جس لمحے ایک شخص گواہ بنتا ہے، شعور مشاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے صاحب بصیرت بن جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں عقل ودانش کی روشنی حاصل ہوجاتی ہے اور یہی روشنی حریت ہے آزادی ہے۔

مجھے ایک کونے میں پڑا ہوا بہت پرانا آئینہ ملا۔ جس پر گرد و غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لگتا تھا وہ آئینہ اب ایسا نہیں رہا جس میں شبیہہ نظر آسکے کیونکہ وہ گرد و غبار میں مکمل طور پر چھپا ہوتھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ صرف گرد ہے آئینہ نہیں۔ لیکن کیا گرد میں چھپنے سے آئینہ واقعی ضائع ہوگیا؟ آئینہ اب بھی آئینہ ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی گرد اس کے اوپر ہے، اندر نہیں۔ گرد ایک پردے ایک اسکرین کی طرح ہے۔ اسنے آئینے کو تباہ نہیں کیا۔ پردہ تو صرف چھپاتا ہے، ظائع نہیں کرتا۔ جیسے ہی پردہ ہٹتا ہے، وہ آشکار ہو جاتا ہے۔

میں نے ایک شخص سے کہا کہ شعور بھی آئینے جیسا ہوتا ہے جسکے اوپر جذبات کی تہہ جمی ہوتی ہے۔ اسکے اوپر احساسات اور جذبات کا پردہ ہوتا ہے۔ اسکے اوپر خیالات کی ایک پرت ہوتی ہے۔ لیکن شعور کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوتی۔ وہ ویسا ہی ہوتا ہے۔

یہ ہمیشہ ویسا ہی رہتا ہے۔ چاہے پردہ ہو یا نہ ہو، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تمام پردے صرف سطح پر ہوتے ہیں چنانچہ اسے کھینچ کر ہٹا دینے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ شعور پر جمی گرد کو صاف کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ویسے ہی جیسے آئینے کی گرد صاف کرنے میں نہیں ہوتی۔

روح کو پانا بڑا سہل ہے کیونکہ گرد کی تہہ کے علاوہ کوئی دوسری رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اور پردہ اٹھتے ہی فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ روح بجائے خود بھگوان ہے۔

میں مووی دیکھ کر واپس آیا ہوں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پردے پر روشنی اور سائے سے کیسی کیسی تصاویر دکھائی جاتی ہیں کہ آدمی مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں کچھ نہیں وہاں ہر چیز ہوتی ہے میں نے مووی دیکھنے والوں کو دیکھا، ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود کو بھولے ہوئے ہیں۔ اور وہاں موجود نہیں ہیں۔ پردے پر نمودار ہونے والی تصاویر کے علاوہ کچھ نہیں۔

سامنے ایک صاف اسکرین ہے جس پر پیچھے سے تصاویر پیش کی جا رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں سامنے لگی ہوئی ہیں اور کسی کو یہ خبر نہیں کہ ان کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

اس طرح لیلا ڈرامہ وجود میں آیا۔

اس کے اندر اور باہر کیا ہوتا ہے۔

انسانی دماغ کے پیچھے ایک پروجکٹر لگا ہوتا ہے۔

نفسیات میں پچھلی چیز کو لاشعور کہا جاتا ہے۔ تمنا، آرزو، جذبات وغیرہ اسی لاشعور میں جمع ہو کر ذہن کے پردے پر مسلسل پروجکٹ ہوتے رہتے ہیں۔ اور پروجکٹر مسلسل اپنا کام، ہلار کے کئے جاتا ہے۔

شعور ایک ناظر ہے، ایک گواہ اور یہ خواہشات کی تصاویر کے بہاؤ میں خود کو بھول جاتا ہے۔ یہ بھول نا آگاہی ہے۔ نا آگاہی، فریب نظر، مشاہدے کی خامی اور زندگی اور موت کا نہ ختم ہونے والا دائرہ اور اسکی جڑیں ہیں۔ نا آگاہی سے بیداری ذہن کے ترک خیالات سے آتی ہے۔ جب ذہن خیالات سے صاف ہو جائے، جب اسکرین سے تصاویر کا بہاؤ رک جائے تب ہی دیکھنے والے کو اپنا وجود نظر آتا ہے اور وہ گھر واپس آجاتا ہے۔

پتنجلی (patanjali) ذہن کے ترک عمل کو یوگا کہتا ہے۔ اگر یہ حاصل ہو جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے۔

گزشتہ روز میں ایک مندر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ لوبان جل رہا تھا اور پورا ماحول خوشبو سے بھرا ہوتھا۔ پھر پوجا کی گھنٹیاں بجیں اور بت کے آگے شمع روشن ہوئی ۔ چند پجاری موجود تھے ۔ خوبصورت انتظامات سے پورا ماحول دلفریب تھا۔ لیکن اس مذہبی رواج کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

نہ مندر، نہ چرچ ، نہ طریقہ عبادت ، نہ انداز دعا غرض کسی چیز کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ۔ تمام بت پتھر ہیں اور تمام دعائیں محض الفاظ ہیں جو دیواروں سے کی جاتی ہیں۔

لیکن لگتا ہے ان سب باتوں سے کچھ خوشیاں ضرور ملتی ہیں۔ اور یہی خطرناک ہے کیونکہ یہیں سے بڑا دھوکہ شروع ہوتا ہے اور پھر ٹھوس شکل اختیار کرلیتا ہے ۔ اسی پرمسرت فریب سے حقیقت پیدا ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ مسرت لاشعور کے ذریعے برآمد کی جاتی ہے ۔ خود کو فراموش اور اپنے وجود کی حقیقت سے فرار حاصل کر کے ۔ نشے کے ذریعے حاصل ہونے والی خوشی بھی اسی فرار کی مرہون منت ہوتی ہے ۔ تمام لاشعوری عمل جو مذہب کے نام پر کیا جائے ، وہ جھوٹی خوشیاں فراہم کرتا ہے جیسے کہ نشہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

خوشی مذہب نہیں ہوتی ۔ کیونکہ یہ صرف دکھوں پریشانیوں کو بھولنا ہے، انکا خاتمہ نہیں ۔

پھر مذہب کیا ہے؟

مذہب خود سے فرار کا نام نہیں ۔ یہ اپنی ذات کے لئے بیداری ہے۔ اس بیداری کا بیرونی انتظامات سے کوئی تعلق نہیں ۔ اسکا تعلق خود اپنی ذات کے اندر سے ہے اور شعور کے حصول سے۔

کہ ہم بیدار ہوکر گواہ بنیں ۔ کہ ہم شعوری طور پر جو ہے اسے جانیں ۔ مذہب کا تعلق صرف اس سے ہے مذہب عدم لاشعور اور عدم لاشعور خوشی ہے۔

ایک کہانی ہے۔

ایک کنواری لڑکی حاملہ ہوگئی ۔ اسکے تمام رشتہ دار پیچھے پڑ گئے ۔ سب اس شخص کا نام پوچھنے لگے جو اسکا ذمہ دار تھا۔ لڑکی نے کہا کہ گاؤں کے باہر بیٹھے ہوئے درویش نے اسکے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لڑکی کے رشتہ داروں نے اسے گھیر لیا اور دھمکیا دیں ۔ درویش خاموشی سے ان لوگوں کی باتیں سنتا رہا اور سادگی سے کہا۔ ''کیا ایسا ہے؟'' اسنے صرف یہ کہا اور پھر رضا کارانہ طور پر لڑکی کے الزام کو قبول کرلیا۔

گھر واپس آنے کے بعد لڑکی نے شدید احساس ندامت محسوس کرتے ہوئے حقیقت کو تسلیم کرلیا۔ اسنے کہا کہ اسنے تو درویش کو کبھی دیکھا تک نہیں۔ اس نے جھوٹ اس لئے بولا تھا تا کہ بچے کے حقیقی باپ کو تحفظ فراہم کر سکے ۔ لڑکی کے رشتہ داروں نے بھی شدید افسوس کیا اور درویش کے پاس جا کر اس سے معافی کے طلبگار ہوئے ۔ درویش نے سب لوگوں کی باتیں خاموشی سے سننے کے بعد کہا۔ ''کیا ایسا ہے؟''

جب ایک شخص کی زندگی میں سکون داخل ہوتا ہے تو دنیا کی تمام باتیں اداکاری سے زیادہ کچھ نہیں رہتیں ۔ میں محض اداکار ہوجاتا ہوں ۔ کہانی باہر چلتی رہتی ہے جبکہ اندر لاوجود سے ڈھنکا ہوتا ہے۔ یہ کیفیت پیدا ہونے کے بعد ہی دنیا کی غلامی سے آزادی نصیب ہوتی ہے۔

باہر سے جو کچھ آتا ہے اگر میں احتجاج کرتا ہوں تو غلام ہوں۔ اگر باہر سے کوئی شخص میرے اندر تبدیلی لاتا ہے ۔ اس طرح میں انحصار کرتا ہوں ۔ اگر میں باہر کی طرف سے آزادی حاصل کرتا ہوں ۔ اسکی کوئی اہمیت نہیں کہ باہر کیا ہوتا ہے تو میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ یہ ذاتی آزادی کی ایک پہچان ہے۔ یہ آزادی اس وقت شروع ہوتی ہے جب لاوجودیت مل جاتی ہے۔

ہمیں اپنی نفی کر کے صفر ہوجانا ہوتا ہے۔ ہمیں خالی پن کا تجربہ کرنا ہوتا ہے۔

چاہے چل رہا ہو، سو رہا ہو، بیٹھا ہو، کھڑا ہو رہا ہو ہر صورت میں دھیان رکھے کہ ''میں خالی ہوں۔'' اور اسے یاد رکھے ۔ خالی پن کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک شخص خالی ہوجاتا ہے۔ خالی پن تمہاری ہر سانس میں سما جاتا ہے۔ جب تمہارے اندر خالی پن کا ورود ہو باہر سادگی ہوجاتی ہے۔ خالی پن بجائے خود الوہیت ہے۔

81

میں آنکھیں بند کیۓ بیٹھا ہوا تھا۔ اور لگتا تھا کہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ آدمی بند آنکھوں سے دیکھنے کا فن بھولتا جا رہا ہے۔ کھلی آنکھوں سے دیکھنے والی چیزوں کا بند آنکھوں سے دیکھنے والی چیزوں سے کوئی موازنہ نہیں۔

میں بیٹھا ہوا بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص آیا۔ اس نے پوچھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ جب میں نے جواباً کہا کہ میں کچھ دیکھ رہا تھا تو وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا۔

''کیا آنکھیں بند کیۓ دیکھنے کو دیکھنا کہا جا سکتا ہے؟''

جب میں آنکھیں کھولتا ہوں تو محدود بصیرت میں آجاتا ہوں۔ اور جب آنکھوں کو بند کرتا ہوں تو لامحدود دنیا میرے سامنے ہوتی ہے۔ میرے ایک طرف دکھائی دینے والا منظر جب کہ دوسری طرف ناظر اور صاحب بصیرت ہوتا ہے۔

ایک خداپرست زاہدہ عورت رابعہ تھی۔ ایک خوبصورت صبح کو کسی نے اس سے کہا۔ ''رابعہ، تم جھونپڑی میں کیا کر رہی ہو؟ باہر آؤ دیکھو خدا نے کتنی حسین صبح تخلیق کی ہے۔''

رابعہ نے جھونپڑی کے اندر سے جواب دیا۔ ''میں یہاں اندر اس کو دیکھ رہی ہوں جسکی بنائی ہوئی صبح تم باہر دیکھ رہے ہو۔ دوست بہتر ہوگا تم اندر آجاؤ۔ باہر کی کوئی خوبصورتی کوئی حسن کوئی حقیقت نہیں رکھتی جو حسن یہاں ہے۔'' لیکن کتنے لوگ اپنی آنکھیں بند کیۓ باہر رہتے ہیں؟ آنکھیں صرف بند کرنے کے لئے بند نہیں کرتے کہ آنکھیں تو بند ہوتی ہیں لیکن بیرونی تصاویر موجود رہتی ہیں۔

آنکھ کے پپوٹے بند ہوتے ہیں لیکن باہری مناظر پھر بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ آنکھوں کا بند کرنا تو نہ ہوا۔

آنکھیں بند کرنے کا مطلب خالی پن ہوتا ہے کہ دماغ اور ذہن میں کچھ نہ ہو یعنی خواب وخیالات سے آزاد۔ جب خیالات اور مناظر غائب ہو جاتے ہیں تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمیشہ رہنے والا شعور ہوتا ہے۔ یہی سچائی ہے، یہی شعور ہے، یہی خوشی اور مسرت ہے۔ تمام کھیل آنکھوں کا ہے جب آنکھوں کی بصیرت بدلتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔

82

ایک برس کا عرصہ گزر گیا کہ میں نے کچھ بیج بوئے تھے۔ اب پھول آچکے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ پھول براہ راست آجائیں لیکن وہ اس طرح نہیں آئے۔ اگر کسی کو پھولوں کی خواہش ہو تو اسے بیج بونے ہوتے ہیں اور پھر کافی انتظار کے بعد اسے پھول دکھائی دیتا ہے۔ یہ طریقہء کار نہ صرف پھولوں کے لئے صحیح ہے بلکہ زندگی کے لئے بھی۔

عدم تشدّد، چوری سے اجتناب، تحائف سے بچنا، سچائی اور تجرّد۔ یہ سب ایسے پھول ہیں جو صحیح زندگی کی پیداوار ہیں۔ کوئی شخص انہیں براہ راست نہیں پیدا کر سکتا۔ انہیں پیدا کرنے کے لئے ہمیں خود آگاہی کا بیج بونا ہوتا ہے۔ جب وہ آتی ہے تو یہ ساری چیزیں خود اسکے پیچھے چلی آتی ہیں۔

خود آگاہی جڑ ہے، باقی سب ظاہری انجام بیرونی طرز عمل کا گھناؤنا پن اندرونی تباہی کی علامت ہوتی ہے جبکہ اسکی خوبصورتی اندرونی زندگی کی بازگشت اور اسکی موسیقی ہے۔ چنانچہ علامات کی تبدیلی سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ تبدیلی وہاں لانی ہوتی ہے جہاں ناپسندیدہ جڑیں ہوتی ہیں۔

اپنی ذات سے ناآگاہی ناپسندیدہ جڑ ہے۔ ''میں کون ہوں؟'' یہ جاننا چاہئے۔ اس بات کو جانتے ہی بے خوفی اور یک رخی حاصل ہو جاتی ہے یک رخی (nonduality) سے آگاہی۔ اور اس بات کو تسلیم کرنا کہ دوسرا بھی ویسا ہی ہے جیسا میں ہوں، تشدّد کی جڑوں کو خاکستر کر دیتا ہے اور اسکے نتیجے میں عدم تشدد جنم لیتا ہے۔

دوسروں کو ''دوسرا'' سمجھنا تشدد پسندی ہے دوسرے لوگوں میں خود کو دیکھنا عدم تشدد ہے اور یہی مذہب کی روح ہے۔

کل رات بارش ہوئی تو میں اندر آ گیا۔ ساری کھڑکیاں بند تھیں، گھٹن سی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کھڑکیاں کھولیں تو تازگی کے ساتھ دھلی دھلائی ہوا کے جھونکے اندر آئے۔ میں گہری نیند سوگیا، اسکے بعد کا حال مجھے نہیں معلوم۔

صبح ایک مردشریف ملاقات کے لئے تشریف لے آئے اس شخص کو دیکھتے ہی مجھے گزشتہ رات کی گھٹن یاد آ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسکے ذہن کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند ہوں۔ اس نے کوئی ایک بھی کھڑکی نہیں کھول رکھی تھی جس سے تازہ ہوا اندر آ سکے۔ اسکے اندر سب کچھ بند تھا۔ میں اس سے گفتگو کرتے ہوئے محسوس کررہا تھا کہ جیسے دیواروں سے محوکلام ہوں۔ اسکے ساتھ میں یہ بھی سمجھا کہ لوگوں کی بڑی تعداد بھی اسی طرح بند کئے ہوئے ہے اور اس خوبصورتی، تازگی اور زندگی کے نئے پن سے محروم ہے۔

آدمی نے خود کو اپنی ہی جیل میں مقیّد کررکھا ہے۔ اس قید کی گھٹن کی جڑوں کو شناخت نہیں کرپارہا ہے۔ یعنی بدمزگی اور بےچینی کی اصل وجہ کی۔ اسکی پوری زندگی اسی طرح گزر جاتی ہے۔ وہ جو کھلے آسمان پر اڑ سکتا ہے لیکن طوطے کے بند پنجرے میں بند ہے۔

ذہن کی دیواریں گرا کر کھلے آسمان پر آیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کھلا آسمان زندگی ہے۔ ہر ایک شخص اس آزادی کو حاصل کرسکتا ہے اور ہر ایک شخص کو یہ آزادی پانی ہے۔

میں یہ بات روزانہ کہتا ہوں، لیکن شاید میرے الفاظ سب لوگوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ ان تمام لوگوں کی دیواریں مضبوط ہیں۔ لیکن دیواریں چاہے جتنی بھی مضبوط ہوں، اصل بات یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر کمزور اور دکھی ہیں۔ اُن میں اچھی علامت صرف یہ ہے کہ وہ تکلیف میں ہین اور تکلیف کو طویل عرصے تک نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ صرف خوشی اور مسرت ہی کو دوام مل سکتا ہے۔

سورج کی روشنی میں عبادت گاہ کے گنبد چمک رہے ہیں۔ آسمان صاف ہے اور سڑک پر لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی ہے۔ میں لوگوں کو سڑک پر چلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ مجھے زندہ کیوں نہیں لگ رہے ہیں۔ ایک شخص کیونکر زندہ کہا جائے جب وہ زندگی سے واقف ہی نہ ہو یا اپنے وجود کو نہ پہچانتا ہو؟ زندگی ملتی ہے اور ختم ہوجاتی ہے لیکن لگتا ہے ہم اسپر توجہ نہیں دیتے۔ عام طور پر زندگی سے اس وقت واقف ہوتے ہیں جب موت آتی ہے۔

میں نے ایک کہانی سنائی۔

ایک شخص نسیان کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ زندہ ہے۔ ایک صبح اٹھا تو جانا کہ وہ مرچکا ہے۔ پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ وہ کبھی زندہ بھی تھا۔

اس کہانی میں ایک بڑی حقیقت ہے۔ مجھے یہ کہانی یاد آئی تو دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت پر ہنسنے لگا کہ کچھ لوگ موت کے ذریعے سمجھتے ہیں کہ وہ بھی کبھی زندہ تھے۔ لیکن اس تکلیف دہ صورت حال کے پیش نظر میری ہنسی آہستہ آہستہ افسوس میں تبدیل ہوگئی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ چند ملاقاتی آ گئے۔ میں نے انہیں دیکھا، انکے الفاظ سنے اور انکی آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے اُن میں کسی قسم کی زندگی نظر نہیں آئی۔ وہ سائے جیسے لوگ تھے۔

پوری دنیا سائے سے بھری ہوئی ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد بھوتوں کی دنیا میں رہتی ہے جسے انہوں نے خود پیدا کیا ہے۔ ان پرچھائیوں میں زندگی ہے لیکن وہ اس سے ناواقف ہیں۔ ان پرچھائیوں کے اندر زندگی ہے اور ان بھوتوں کی زندگی سے آگے حقیقی زندگی ہے جسے اسی وقت، اسی جگہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اسے حاصل کرنے کی شرط بھی انتہائی آسان ہے کتنی آسانی سے وہ حاصل ہوسکتی ہے جیسا کہ میں نے گزشتہ کل کہا تھا۔ ''وہ بصیرت ہے جو اندر سے ہو۔''

ایک جوان آدمی آیا اور کہا۔ ''میں ملحد بن چکا ہوں۔'' میں نے اسکی طرف دیکھا۔ میں اسے پہلے سے جانتا ہوں ۔ اُسے حقیقت کو جاننے کی انمٹ پیاس ہے۔ وہ بہر قیمت حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ بہت ذہین آدمی ہے اور سطحی یقین سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ رسم ورواج، لیپاپوتی سے اسے کچھ نہیں حاصل ہوتا اور شک نے اسے پکڑ رکھا ہے۔ اسے ذہنی وسوسوں نے ہلا کر رکھ دیا اور وہ منفی راہ پر چل نکلا۔

میں خاموش ہوں۔ اسنے دوبارہ کہا۔ ''خدا پر میرا ایمان نہیں رہا۔ خدا ہے ہی نہیں میں بے دین ہوگیا ہوں۔'' میں اس سے پوچھتا ہوں۔ ''برائے مہربانی ایسا نہ کہو۔ ملحد ہونا، بے دین ہونا نہیں ہوتا۔ خداپرست ہونے کے لئے ایک شخص کو ایک دور سے گزرنا ہوتا ہے ۔ یہ تو مذہبی بننے کی ابتدا ہے غیر مذہبی بننے کی نہیں، خیالات، ماحول وغیرہ کے ذریعے ملنے والی خداپرستی، خداپرستی نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو اس سے مطمئن ہوجاتے ہیں، وہ مغالطے میں ہیں۔ ان کی پرورش کسی دوسرے خیال کے ماحول میں کوئی انکا ذہن مخالف سمت میں ہوجاتا ہے پھر وہ اسیر راضی بہ رضا ہوجاتا ہے۔

''ذہن کی تعمیر دائرے میں ایک مرحلہ ہوتا ہوتا ہے جو سطح کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ ایک مردہ پرت ہوتی ہے۔ یہ مستعار لی ہوئی کیفیت ہے۔ ایک ایسا شخص جسے روحانیت کی پیاس ہو، اس کو تصوراتی پانی سے نہیں بجھایا جاسکتا۔ ان معنوں میں اس شخص پر خدا کی رحمت ہے کیونکہ پیاس کی اسی شدت کی بناء پر حقیقی پانی کی تلاش ممکن ہوتی ہے۔ خدا کا شکر کہ تم خدا کے تصور سے متفق نہیں ہوئے کیونکہ اسی عدم اتفاق سے تم خدا کی سچائی تک پہنچ سکو گے۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ اس جوان کے چہرے پر ایک قسم کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک سکون، ایک یقین اسکی آنکھوں میں چمک رہا ہے۔ جب وہ میرے پاس سے جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ ''اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ الحاد ہی مذہبی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے یہ ابتدا ہے اختتام نہیں، یہ ایک پس منظر ہے لیکن کسی کو یہاں رکنا نہیں چاہئے ۔ یہ گھپ اندھیری رات ہے۔ کسی کو اس میں ڈوبنا نہیں چاہئے۔ اس کے بعد، اسی کے ذریعے صبح طلوع ہوتی ہے۔''

گزشتہ شب، شہر سے دور، ہم لوگ ایک آدم کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر تھوڑے سے بادل تھے اور چاند اس سے آنکھ مچولی کر رہا تھا۔ اس روشنی اور پرچھائیں کے کھیل میں کچھ لوگ میرے ساتھ خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔

کبھی کبھی کچھ بولنا کتنا مشکل ہوجاتا ہے جبکہ ماحول نغموں اور موسیقی سے لبریز ہو۔ اس وقت کوئی شخص بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے کہ ماحول میں کوئی خلل نہ پڑجائے۔ گزشتہ رات ایسا ہی ہوا۔ ہم رات کافی دیر سے گھر لوٹے۔ راستے میں کسی نے رائے زنی کی۔ ''میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار خاموشی کا تجربہ کیا ہے۔ میں نے سن تو رکھا تھا کہ خاموشی روحانی سکون اور کامل مسرت ہوتی ہے لیکن آج اسکا یقین ہوگیا۔ آج بلا کچھ کئے اسکا تجربہ ہوگیا۔ اب دیکھیں دوبارہ کب ہوتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جو بلا کسی کوشش کے ہوتا ہے وہ صرف بلا کوشش کے ہی ہوتا ہے۔ اسے کوشش سے نہیں کیا جاسکتا۔''

کوشش بجائے خود بے اطمینانی ہے۔ کوشش کا مطلب یہ ہے کہ اس سے کچھ مختلف چیز جسکی خواہش ہو۔ یہ مرحلہ کھنچاؤ کا ہے۔ اور کھنچاؤ سے صرف کھنچاؤ ہی جنم لیتا ہے۔ کوئی ایسی چیز جس کو بے آرامی کہا جائے اس کا نتیجہ بھی بے آرامی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے بے آرامی سکون میں نہیں بدلتی۔

سکون ایک مختلف شعور ہے۔

جب بے آرامی نہ ہو تو سکون ہے۔

کچھ نہ کرو، کوئی کوشش نہ کرو، سب کچھ چھوڑ کے صرف دیکھتے رہو۔ پھر ایک نیا شعور پاؤ گے۔ ایک نئی روشنی جو آہستہ آہستہ اندر اترتی جائے گی۔

جو کچھ اس نئے جہان میں ملے گا وہ وہی ہوگا جو حقیقت ہے۔

القا کیا ہوتا ہے، خوشی ومسرت، یہ آزادی ہے۔ کائنات کی وسعت ہماری حقیر کوششوں سے نہیں ملا کرتی۔ ہمارے ''میں'' بلکہ یہ اس وقت ملتی ہے جب کسی قسم کی کوشش نہ کی جائے۔ جب ''میں'' میں نہیں ہوتا ہوں۔

دنیا میں جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے وہ کچھ کرنے سے حاصل ہوتا ہے، جسکا مطلب کو

شش ہوتا ہے۔ ''میں'' مرکز ہے چنانچہ ہر ایک حصول ''میں'' کو قوی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ حاصل کرنے کی خوشی ''میں'' کو قوی اور بڑھانے میں ہے۔ لیکن یہ ''میں'' کبھی نہیں بھرتا۔ یہ قدرتی طور پر نہایت حریص ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں خوشی دکھائی دیتی ہے حالانکہ وہ حقیقتاً وہاں نہیں ہوتی۔ چنانچہ جاننے والے کہتے ہیں کہ دنیا میں غم واندوہ کے علاوہ کچھ نہیں۔

ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں ویسا ہی آزادی کے لئے بھی کرتے ہیں۔ ہم آزادی حاصل کرنے کے لئے مصروف ہوتے ہیں۔ اور یہی غلطی ہوتی ہے۔ اس سے حاصل تو کچھ نہیں ہوتا لیکن خود کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جب کوئی خود کو ضائع کر لیتا ہے تو یہ حاصل ہو جاتی ہے۔

87

کل رات بہت دنوں بعد میں دریا کنارے گیا تھا۔ دریا چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ وہاں کا راستہ گھوم کر دور سے تھا۔ ایک مچھیرا اپنی چھوٹی سی کشتی کو کھیتا ہوا آیا تو پانی کے پرندے خاموش ہو کے اسکی آواز سننے لگے۔

میرے ساتھ ایک دوست تھا۔ اس نے ایک مذہبی گیت گانا شروع کر دیا، پھر گفتگو کا موضوع خدا کی ذات تک پہنچ گیا۔ گیت کا مرکزی خیال خدا کی جستجو سے متعلق تھا۔ گانے والے کی زندگی کے کئی برس خدا کی تلاش میں گزر گئے تھے۔ میں اس سے پرسوں ہی ملا تھا۔ اسنے سائنس میں گریجویشن کی سند حاصل کی تھی پھر ایک دن وہ خدا کی جستجو میں لگ گیا۔ اسکے بعد اس جستجو میں کئی برس گزار دئے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔

میں اس گیت کو سننے کے بعد خاموش رہا۔ اسکی آواز اچھی اور دل کو چھونے والی تھی جبکہ اسکا دل گیت میں لگا ہوا تھا اس لئے گانے میں زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ گانے کی بازگشت میرے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے یکا یک کہا کیا خدا کی جستجو خوش خیالی ہے۔ ''مجھے ابتدا میں بڑی امید تھی۔'' اسنے کہا۔ ''لیکن رفتہ رفتہ میں مایوس ہو گیا۔''

کچھ دیر تک خاموش رہا۔ پھر کہا۔ ''خدا'' کی جستجو یا تلاش ایک فریب ہے کیونکہ اسے تلاش کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، وہ تو ہمیشہ سے موجود ہے لیکن ہمارے پاس اسے دیکھنے والی آنکھیں نہیں ہیں۔ چنانچہ صحیح تلاش صحیح بصیرت حاصل کرنے میں ہے۔''

ایک نابینا شخص تھا۔ وہ باہر نکلا تاکہ سورج کو تلاش کر سکے۔ اس کی تلاش اور جستجو غلط تھی کیونکہ سورج تو پہلے ہی موجود ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ آنکھیں ہیں۔ ایک شخص کو جیسے ہی آنکھیں ملتی ہیں سورج مل جاتا ہے۔ عام طور پر خدا کی خواہش رکھنے والے خدا کو براہ راست پانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھ کے متعلق سوچتے ہی نہیں۔ یہ بنیادی غلطی مایوسی کا سبب بنتی ہے۔

میرے دیکھنے کا انداز مختلف ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی سوال میرے متعلق ہے اور میری قلب ماہیت کے متعلق۔ جیسا میں کہ ہوں، جیسی میری آنکھیں ہیں۔ صرف وہی تنہا میرے علم کی حد ہے اور میری نظر کی

حد بھی۔ اگر میں تبدیل ہوتا ہوں، اگر میری آنکھیں بدل جاتی ہیں، اگر میرا شعور اجاگر ہوجاتا ہے تب نہ آنے والا بھی دکھائی دینے لگے گا۔ اسکے بعد خدا دنیا میں بھی مل جاتا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ مذہب خدا کو پانے کی سائنس نہیں لیکن ایک نئ بصیرت ایک نیا شعور پانا ہے۔ خدا تو پہلے ہی ہے، ہماری جڑیں اس میں ہیں۔ ہم اسی میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس چونکہ آنکھیں نہیں ہیں اس لئے ہمیں سورج نہیں دکھائی دیتا۔ کسی کو سورج دیکھنے کی خواہش کے بجائے آنکھوں کی خواہش کرنی چاہئے۔

88

گوتم بدھ نے بصیرت پر مبنی چار حقائق کا ذکر کیا ہے۔ ابتلا، رنج اور صدمہ۔ اس اتبلا کی وجہ، ابتلا کو نظر انداز کرنا۔ زندگی میں مصیبت اور پریشانیاں ہوتی ہیں تو اس اتبلا کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اس مصیبت کو ختم کر سکتے ہیں اور اس خاتمے کے لئے ایک راستہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان بصیرت افروز خیالات کے علاوہ ایک اور بھی ہے جو ان چاروں سے قبل موجود ہوتے ہیں۔ یہ چاروں کی پیدائش کی وجہ پانچواں ہے۔ لیکن اسکی موجودگی سے قبل وہ چاروں بھی نہیں پیدا ہوتے۔

وہ پانچویں چیز کیا ہے۔ یا پھر یوں کہیں کہ پہلا۔ حقیقت پر مبنی؟

یہ حقیقت ہمارے اتبلا کا لاشعور ہے۔ کہ ہم ابتلا میں تو گرفتار ہوتے ہیں لیکن ہمیں اسکا علم نہیں ہوتا۔ یہ اسی لاشعور کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ہم ابتلا میں ہوتے ہیں لیکن اسکی اذیت کو محسوس نہیں کرتے۔ ہماری پوری زندگی اس ڈھنکے چھپے لاشعور کے ساتھ گزر جاتی ہے اور اسی خوابیدگی میں اس مصیبت کو جھیلتے رہتے ہیں۔

یہ لاشعور کیا ہے، یہ ہماری آنکھوں میں نہیں آتا اور نہ ہمارے خوابوں میں۔ ہماری آنکھیں حال کو نظر انداز کر کے مستقبل پر لگی رہتی ہیں۔ مستقبل کے حسین خوابوں کے خمار میں حال کی مصیبتیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اس لئے اس سے بچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جب ایک قیدی کو اپنی زنجیروں اور جیل کی دیواروں سے آگاہی نہ ہو تو آزادی کی آرزو کیونکر پیدا ہوگی؟ یہی وجہ ہے جو میں ابتلا کو پہلا درجہ دیتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اپنی ابتلا کے لاشعور سے ناواقف ہیں۔

یہ حقیقت کہ زندگی ابتلا کا شکار ہے ہمارے شعور میں نہیں ہوتا۔ دوسرے چاروں اسکے بعد ہیں۔

میں چند باتیں کہتا ہوں جنہیں انگیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

پہلی یہ کہ ذہن یا دماغ کو جاننا ہوتا ہے۔ دماغ جو انتہائی قریب ہونے کے باوجود ہم اس سے ناواقف ہیں۔

دوسری یہ کہ دماغ کو منقلب یا تبدیل کیا جاتا ہے۔ دماغ جو بہت ہی خود سر ہوتا ہے۔ لیکن تبدیلی کا آرزومند بھی۔

تیسری بات کہ دماغ کو آزاد کرنا ہوتا ہے۔ دماغ جسے مکمل طور پر محکوم ہونے کے باوجود یہیں اور اسی وقت آزاد کیا جا سکتا ہے۔

یہ گنتی کے حساب سے تین چیزیں ہیں لیکن کرنی صرف ایک چیز ہے اور وہ چیز یہ ہے کہ دماغ کو سمجھا جائے۔ اگر ہم اس ایک بات کو کرلیں تو دیگر دو باتیں خود بخود ہو جائیں گی۔ دماغ کو جاننا اور سمجھنا اسکی تبدیلی ہے۔ اسکو سمجھنا ہی آزادی ہے۔

میں کل یہی باتیں کہہ رہا تھا کہ ایک آدمی نے پوچھا۔ ''اسے کس طرح سمجھتے ہیں؟''

یہ آگاہی بیداری کے ذریعے آتی ہے۔ ہمارے دماغ اور جسم کا ہر عمل لاشعور ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ہر عمل میں بیدار ہوں۔ چاہے کوئی چل رہا ہو، بیٹھا ہو یا لیٹا ہوا ہو۔ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اسے یاد رکھے۔ ''میری خواہش ہے کہ بیٹھوں۔''

تو اسے اس خواہش کو جاننا چاہیئے اور ان محسوسات کو بھی چاہے دماغ میں غصہ ہو یا نہ ہو۔ اسے اس کیفیت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ چاہے خیالات کا بہاؤ ہو یا نہ ہو۔ ایک شخص کو اسکا گواہ بھی ہونا چاہیئے۔

یہ بیداری اپنے کسی عمل کو روک کر یا کوششوں سے نہیں آسکتی۔ کسی قوت فیصلہ، کسی اچھے اور برے میں تمیز کئے بغیر صرف اور صرف بیداری۔ جیسے ہی بیداری آئی، دماغ کے اسرار ظاہر ہونے لگیں گے۔ دماغ سمجھ میں آجائیگا۔ اس طرح جاننے اور سمجھنے سے تبدیلی وقوع پزیر ہوتی ہے۔ جب بیداری کی تکمیل ہوگی تو آزادی مل جائے گی۔

چنانچہ میرا خیال ہے کہ دماغ کی بیداری سے آزادی ممکن ہے کیونکہ تشخیص ہی اسکا علاج ہے۔

دوپہر قریب قریب گزر گئی۔ آسمان صاف ہے لیکن تیز ہوائیں چلیں اور سیاہ بادل چھا گئے۔ سورج پوشیدہ ہوگیا۔ ہوا میں ہلکی ٹھنڈک آگئی۔

دروازے پر ایک فقیر آیا، اسکے ہاتھ میں ایک طوطا ہے کوئی پنجرہ نہیں۔ لگتا ہے جیسے طوطا اڑنا بھول چکا ہو۔ انکے آنے کے بعد بات کرنے والا طوطا بولا، فقیر نہیں ''رام رام جپو رام کا نام، جپو رام کا نام۔'' میں نے کہا کہ ''طوطا تو خوب بولتا ہے۔'' فقیر نے کہا ''سر، یہ طوطا ایک عظیم پنڈت ہے۔'' میں نے یہ سنا تو ہنسا پھر کہا۔ ''اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے کیوں کہ سارے پنڈت کچھ اور نہیں طوطا ہوتے ہیں۔''

مجھے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ علم پڑھنے اور مطالعے سے نہیں آتا اور پڑھنے سے جو کچھ آتا ہے وہ علم نہیں ہوتا۔ علم قوت استدلال سے حاصل ہونے والی چیز نہیں۔ قوت استدلال سسٹم ہے جبکہ علم یادداشت سے نہیں بلکہ یادداشت ختم کرنے سے آتا ہے۔ مطالعے اور پڑھنے سے صرف طوطا ہاتھ آتا ہے اور طوطے کی ان باتوں کو علمیت کہا جاتا ہے۔ علم کے راستے میں سے بڑی کوئی دوسری رکاوٹ نہیں۔

علمی کارنامہ مردہ حائق کو جمع کرنا ہے۔ اسکے تمام واقعات مستعار ہوتے ہیں۔ اسکی جڑیں تجربے میں نہیں ہوتیں۔ ایک دماغ جسمیں یہ واقعات جمع ہوں وہ یہ نہیں دیکھ پاتا کہ وہ ہے کیا۔ وہ واقعات ایک پردہ بن جاتے ہیں۔

ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ پردہ ہٹ گیا۔

اسکی آگاہی اور بصیرت علم ہے۔ بصیرت اور دیکھنا (مطالعہ اور پڑھنا نہیں) علم ہے۔

سچائی سے دیکھنا۔ صحیفہ، نہ کوئی واقعہ۔ وہ راستہ ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے۔ جب سچائی دکھائی دیتی ہے تو ایک شخص سمجھ لیتا ہے کہ علم تو وہاں موجود تھا۔ صرف ہم ہی ہیں جس کے پاس دیکھنے والی آنکھیں نہیں ہیں۔ اور آنکھیں علمی کارناموں کے جمع ہونے سے نہیں ملتیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ خود فریبی ہاتھ لگتی ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں حقیقت کو جانے بغیر ایک شخص انا اور خود پسندی سے بھر جاتا ہے کہ وہ یہ جانتا ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ''میں جانتا ہوں'' یہ کہنا جہالت ہے۔ کیوں؟ کیونکہ جاننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ''میں نہیں جانتا'' صرف آگاہی ہے نہ تو جاننے والا ہے نہ پہچاننے والا۔

یہ ایک رخی بصیرت اسی وقت ملتی ہے۔ جب سب چیزوں سے پیچھا چھڑالیں ۔ اور خالی بن جائیں ہوجائیں ۔

91

دھندھلکا شروع ہوا اور شام کے پھولوں کی خوشبو پھیلنی شروع ہوگئی ۔ پوری دوپہر ایک کوئل کوکتی رہی تھی اور اب خاموش ہوچکی ہے۔ جب وہ نغمہ سرا تھی تو میری زیادہ توجہ نہیں تھی لیکن اب جب کہ وہ خاموش ہے تو میری توجہ اسی طرف ہے۔ میں اسکی کوک کا منتظر تھا کہ ایک درویش آگیا ۔ وہ ایک برہچاری (تارک الدنیا) اور لاغرسا بیمار شخص ہے۔ اسکا چہرہ زرد اور مرجھایا ہوا ہے اسکی آنکھیں خشک ہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے رحم آگیا ۔ اس نے اپنے جسم کے ساتھ زیادتی کی میں اس بات کو اس سے کہتا ہوں جس سے اسے دھچکا سا لگتا ہے۔ وہ اسے ترک تیاگ اور پرہیزگاری سمجھتا ہے ۔ جیسے کہ خراب صحت روحانیت ہے۔ جیسے شکل کو بگاڑ لینا، صورت کو خراب کر لینا ہی یوگا کی مشق ہے جیسے کسی مکروہ چیز کو نظر میں لانا روحانیت ہے۔

کاؤنٹ کیسرلنگ نے کہیں لکھا ہے۔ ''صحت روحانیت کے خلاف ایک سوچ ہے۔'' اس لائن میں بھی جہالت کی بازگشت ہے۔ یہ خیال ردّعمل کی پیداوار ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو صرف اپنے جسم کا خیال رکھتے ہیں۔ انکے لئے جسم کی صحت بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ یہ ایک انتہا ہے۔ اس کے ردّعمل میں دوسری انتہا پیدا ہوئی ۔ لیکن دونوں سوچ مادیت پر مبنی ہے۔

نہ تو کوئی اپنے جسم کو ہر جگہ پھنساتا ہے اور نہ کوئی ناکارہ بناتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جسم صحت مند اور اچھا ہو۔

روحانی زندگی صحت کے خلاف نہیں ہوتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مکمل صحت ہے یہ خوش آئند آواز نغموں اور حسن کے مترادف ہے۔

جسم کو اذیت دینا روحانیت نہیں ہے۔ یہ اخلاقی نظریہ ہے۔ یہ زندگی کے ساتھ ردّعمل جیسا ہے۔ اس میں کوئی علم نہیں بلکہ جہالت اور خود کو اذیت دینا ہے۔ یہ پرتشدد رجحان ہے۔ اس کے ذریعے کوئی کہیں نہیں پہنچ پاتا ۔ ایک شخص جو اپنے جسم کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا وہ صرف معصوم اور پیرو ہے میں اگر اپنے جذبات اور خواہشات کے ساتھ چلوں تو وہ میری پیروی کرتا اور ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تالیف قلب ٹھونک پیٹ کے نہیں کی جاتی ، پیروی کرنے سے ہوتی ہے۔

میں سکون ، امن ، خوشیوں اور آزادی کی بات کرتا ہوں ۔صرف یہی زندگی کی جستجو ہے۔ اگر نہ سمجھا گیا تو زندگی برباد ہے۔ گزشتہ دن میں یہ کہہ رہا تھا تو ایک جوان آدمی نے پوچھا۔ ''کیا ہر ایک شخص آزادی حاصل کرسکتا ہے؟ اور اگر ہر شخص کرسکتا ہے تو یہ آسانی سے حاصل کیوں نہیں ہوتی ؟''

میں نے اسے ایک کہانی سنائی ۔

ایک صبح کسی شخص نے یہی سوال گوتم بدھ سے کیا۔ بدھا نے اس سے کہا کہ تم جا کر شہر میں گھومو پھرو اور یہ جان کر واپس آؤ کہ کتنے لوگ زندگی میں کیا چاہتے ہیں۔ وہ شخص گیا اور ہر دروازے سے معلومات لیکر شام کو واپس آیا، اس طرح کہ تھک کر بے حال تھا لیکن اسکے ہاتھ میں ایک مکمل لسٹ تھی کوئی شہرت کا طلبگار تھا، کچھ لوگ اعلیٰ مرتبہ چاہتے تھے، کچھ صحت کے خواہشمند تھے، لیکن ان میں سے کوئی شخص آزادی کا خواستگار نہیں تھا۔ بدھا نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ اور اب سوال کرو۔''

ہر ایک شخص آزادی پاسکتا ہے، وہ تو وہاں پہلے ہی موجود ہے لیکن کیا تم اسے محض ایک بار دیکھ سکتے ہو؟ ہم سب لوگ اس سے منہ موڑے کھڑے ہوئے ہیں۔''

یہی میرا جواب ہے۔ ہر شخص آزادی حاصل کرسکتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے ہر بیج پودا بن سکتا ہے ۔ یہ ہماری اہلیت صلاحیت ہمارے امکانات پر ہے لیکن اس اہلیت کا رخ حقیقت کی طرف کرنا ہوتا ہے۔ میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ ایک بیج کا کام رخ موڑنا ہے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ۔ یہ بہت آسان ہے۔ بیج صرف مرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور پھر اسی وقت شگوفہ پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر ہم بھی مرنے کے لئے تیار ہوں تو آزادی فوراً مل سکتی ہے۔ ہماری ''میں'' رکاوٹ بنتی ہے، جیسے ہی یہ ختم ہوئی آزادی مل گئی ۔

''میں'' کے ساتھ ہم دنیا میں ہیں، اگر ''میں'' نہ ہوتو ہم آزاد ہیں۔

ایک سال گزر گیا۔ گزشتہ برسات میں ، میں نے پھول کا ایک بیج بویا تھا۔ جیسے ہی موسم برسات ختم ہوا پھول بھی غائب ہوگئے ۔ پھر میں نے سوکھے ہوئے پودوں کو نکال دیا اس سال میں دیکھ رہا ہوں کہ برسات آتے ہی gultevari plants میں از خود شگوفے پھوٹ رہے ہیں ۔ وہ زمین میں کئی جگہ سے نکل رہے ہیں۔ زمین میں بیج پچھلے سال ڈالا گیا تھا، ایک سال بعد وہ اگ پایا۔ اور اب اسکی خوشیوں بھری زندگی ہے۔ زمین کے اندر اندھیرے میں، سردی گرمی میں بڑا انتظار کرتا رہا۔ اب اسے موقع ملا کہ وہ دوبارہ روشنی دیکھے۔ اس کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ وہ مبارک اور مسعود تقریب سے لطف اندوز ہو تجربہ کرے۔

صدیوں قبل کسی nectar sweet throat نے گایا تھا۔ tamaso ma jyotirgamaya جسکی خواہش یہ تھی کہ وہ تاریکی سے روشنی میں نہ آئے ۔

کیا ہر ایک شخص میں یہ بیج پوشیدہ نہیں ہیں ہر زندہ شخص روشنی کی تمنا کرتا ہے ؟ کیا زندگی میں اس موقع کے لئے انتظار اور دعا نہیں کی جاتی ؟

یہ بیج ہر ایک شخص کے اندر چھپے پڑے ہیں اور صرف اسی بیج کی وجہ سے مکمل ہونے کی پیاس جنم لیتی ہے۔ یہ لو ہر ایک شخص کے اندر چھپی ہوئی ہے اور یہ شعاع چاہتی ہے کہ کسی طرح آفتاب کے روبرو ہو۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک لبریز نہیں ہوتا جب تک ان بیجوں کو پودوں میں تبدیل نہ کردے۔ مکمل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ۔ ہر شخص مکمل ہوسکتا ہے، کیونکہ ہر بیج میں مکمل ہونے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔

94

ایک نئی صبح ۔
ایک نیا آفتاب ۔
سورج کی نئی روشنی ۔
نئے پھول ۔

میں نیند سے بیدار ہوا ہوں ۔ ہر چیز نئی اور تازہ ہے۔ دنیا میں کوئی بھی چیز پرانی اور باسی نہیں ہے۔

کئی سو برس پہلے heraclitus نے یونان میں کہا ۔ ''یہ ممکن نہیں کہ اسی دریا میں دوبارہ اترا جائے ۔''

ہر چیز نئی ہے لیکن آدمی فرسودہ بن گیا ہے۔ یا یوں کہو کہ آدمی نئے میں نہیں رہتا چنانچہ پرانا اور فرسودہ بن گیا ہے۔ آدمی یادوں میں رہتا ہے، ماضی میں، موت میں یہ محض رہنا ہے زندگی نہیں یہ آدھی موت ہے اور اس آدھی موت کو لئے ہوئے ہم ایک دن کوچ کر جاتے ہیں۔

زندگی نہ تو ماضی میں ہے اور نہ مستقبل میں ۔
زندگی بس حال میں ہے۔

وہ زندگی صرف یوگا سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ یوگا ایک شخص کو بیدار کر کے ہمیشہ رہنے والی تازگی میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ بیدار کرنے کے بعد قائم ودائم رہنے والی نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ یوگا ایک شخص کو ابدی حال میں لے آتا ہے۔

ایک شخص ''جو کہ ہے'' اسی میں بیدار ہوتا ہے۔ کیا تھا، وہ نہیں رہتا ۔ کیا ہوگا، وہ بھی نہیں ۔ اور جو آشکار ہوگا، وہ صرف اس وقت ہوگا جب آدمی ذہن سے یادوں اور تصورات کا بوجھ اتار پھینکے گا۔

یادیں گزرے ہوئے ماضی کا اجتماع ہوتی ہیں ۔ اس سے زندگی نہیں ملا کرتی ۔ تصورات یادوں کی شاخیں ہوتی ہیں۔ یہ صرف اس کی بازگشت اور اس سے منسوب چیز ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے جانی پہچانی جگہ میں ٹہلتے رہیں ۔ انجانے اور نئے دروازے اس سے نہیں کھلتے ۔

جانی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دو تا کہ نئی آشکار ہوسکیں ۔
مرے ہوؤں کو چھوڑ دو تا کہ نئے ظاہر ہوسکیں ۔
صرف یہی یوگا کا نچوڑ ہے ۔

95

رات گہری ہو رہی ہے۔ آسمان پر صرف چند ستارے ہیں اور مغرب کے افق پر پورا چاند ابھی تک نہیں روشن ہوا ہے چنبیلی کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور اسکی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی ہے۔

میں نے دروازے پر ایک عورت کو دیکھا۔ میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ کسی پریشانی نے اسکے ذہن کو گھیر رکھا ہے، اسکی تاریکی نے اسکے گرد ہالہ بنا رکھا ہے۔ میں نے اسکی پریشانی کا تاثر اسکے آتے ہی محسوس کرلیا تھا۔ بغیر وقت ظائع کئے اس نے یکا یک سوال کیا۔ ''کیا پریشانیوں کو ختم کیا جاسکتا ہے؟'' میں نے اسے دیکھا۔ وہ قبر پر لگا ہوا پریشانیوں کا ایک کتبہ دکھائی دے رہی تھی۔

آہستہ آہستہ سب لوگ اسی کی طرح قبر کا کتبہ ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ تمام کے تمام لوگ پریشانیوں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں لیکن ایسا اس لئے نہیں کر پاتے کیونکہ انکی پریشانیوں کی تشخیص درست نہیں ہوتی۔

پریشانیاں ایک خاص شعور کی کیفیت میں ہوتی ہیں۔ یہ ایک کیفیت کا فطری میلان ہے۔ اس کیفیت میں رہتے ہوئے پریشانیوں سے آزادی ناممکن ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ کیفیت بجائے خود دکھ اور پریشانیاں ہیں۔ اگر تم ایک دکھ کو دور کرتے ہو تو اسکی جگہ ایک دوسرا دکھ سنبھال لیتا ہے۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ تم ان دکھوں سے خود کو آزاد کرتے رہتے ہو لیکن ان پریشانیوں سے حقیقتاً نہیں بچ پاتے۔ پریشانیاں تو قائم رہتی ہیں لیکن وجوہات تبدیل ہوجاتی ہیں۔

دکھ پریشانی وغیرہ سے گلوخلاصی اور آزادی اس وقت ملتی ہے جب شعور کی کیفیت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے نا کہ ذاتی دکھ سے آزاد ہونے کے بعد۔

ایک اندھیری رات میں ایک جوان شخص گوتم بدھا کے پاس پہنچا۔ وہ اداس اور پریشان تھا۔ اسنے کہا۔ ''دنیا کتنی پریشانیوں کی جگہ ہے۔'' گوتم بدھا نے کہا۔ ''تم یہاں آؤ جہاں میں ہوں، یہاں کوئی پریشانی نہیں، یہاں کوئی تکلیف نہیں۔''

یہاں شعور کی ایسی کیفیت ہے، جسمیں کوئی دکھ کوئی پریشانی نہیں۔ بدھا نے اس شعور کی جانب اشارہ کیا تھا اور یہ اصطلاح استعمال کی ''جہاں میں ہوں۔''

انسانی شعور کی دو کیفیات ہوتی ہیں۔ ایک جہالت دوسری باتوں کا علم ہونا۔ ایک دوسرے کی شناخت اور دوسری خود آگاہی۔ جب تک میں خود دوسرے کی شناخت بنا رہوں گا تو پریشانیاں ہوں گی۔

دوسرے کی غلامی کا نتیجہ پریشانی ہے۔ دوسرے سے آزادی، خود سے آگاہی پریشانیوں کا خاتمہ ہے۔ میں ابھی تک ''میں'' نہیں بنا اس لئے پریشان ہوں۔ جب میں واقعتاً ''میں'' بن جاؤں گا پریشانیاں غائب ہوجائیں گی۔

آج رات آسمان پر ستارے نہیں ہیں سیاہ بادلوں کی پیشن گوئی ہے جو کبھی کبھی بوندا باندی کر رہے ہیں۔

رات کی رانی کے پھول کھلے ہوئے ہیں جس کی خوشبو ہوا میں شامل ہے۔

میں قریب قریب ایسا ہوں جیسے ہوں ہی نہیں۔

اور اس عدم وجود کی کیفیت میں وجود بن چکا ہوں۔

اس دنیا میں موت زندگی ہے اور کھونا دراصل پانا ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ قطرے کو سمندر میں ملنا ہے۔ اب مجھے لگتا ہے کہ سمندر خود آ کر قطرے میں مل گیا ہے۔ آدمی کے لئے "ہونا" غلامی ہے ذہن کا خالی ہونا آزادی ہے۔ وجود ہونے کا کھنچاؤ ایک شخص کو غیر ضروری طور پر پریشان رکھتا ہے۔ اور ذہن کے خالی ہونے کا خوف ایک شخص کو "مکمل" ہونے سے روکتا ہے۔ جب تک کچھ نہ ہونے کے لئے تیار نہ ہوں تو ایک شخص کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جب مرنے کی ہمت نہ ہو، ایک شخص موت کے اردگرد گھومتا رہتا ہے۔ لیکن جب ایک شخص موت کو قبول کر لیتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ موت کا کوئی وجود نہیں۔ اور ایک شخص جب شکست وریخت کے لئے تیار ہو تو دیکھتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز ہے جسے شکست وریخت سے دوچار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بظاہر لغو لیکن یہ باطن گہری بات زندگی کا قانون ہے۔ اس قانون کو جاننے کے لئے یوگا ہے۔ اور اسے اچھی طرح سے جاننا، اس سے باہر ہونا ہے۔ اس قانون سے ناواقفیت ہی انسان کو پریشان رکھتی ہے۔ اور اس سے واقفیت ساری پریشانیاں ختم کر دیتی ہے اور وہ حاصل ہو جاتا ہے جو سفر کا اختتام ہے۔ نہیں صرف ایک رات کے قیام کے بعد۔

پورے چاند کی رات میں چند لوگ شراب خانے سے دریا پر گئے تا کہ وہاں کشتی کی سیر کریں۔ آدھی رات سے صبح تک مسلسل کشتی چلاتے رہے۔ جب صبح کی خنک ہوائیں چلیں اور سورج طلوع ہوا تو انکا نشہ کم ہونا شروع ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ واپسی کا وقت آ گیا۔ وہ ساحل پر اترے کہ دیکھیں کتنا سفر کیا ہے۔ لیکن انکی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا وہ عین اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے گزشتہ رات کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ وہ چپو تو چلاتے رہے لیکن کشتی کو کھولنا بھول گئے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ساحل پر بندھی ہوئی کشتی کو کھولا بھی جاتا۔ میں نے یہ کہانی شام کو سنائی۔ ایک بوڑھا شخص مجھ سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔ اسنے کہا۔ "میں اپنی پوری زندگی چلتا رہا لیکن آخر میں معلوم ہوا کہ میں کہیں بھی نہیں پہنچا۔" یہ وہی شخص ہے جسکو میں نے یہ کہانی سنائی تھی۔

آدمی کو شعور نہیں ہے۔ خود سے آگاہی نہ ہونے کا باعث اسکا لاشعور ہے۔ اسکے لاشعور میں تمام اعمال میکانیکی ہوتے ہیں۔ اسکا چلنا ذہانت کی کیفیت میں نہیں ہوتا، ایسے ہی جیسے کوئی عالم خواب میں چلتا ہے، اس لئے کہیں بھی نہیں پہنچتا۔

جیسے کشتی ساحل پر لگے کھونٹے سے بندھی ہو، بالکل ویسے ہی اس کیفیت میں وہ کسی چیز سے بندھا ہوتا ہے۔

مذہب اس غلامی کو خواہش کا نام دیتا ہے۔ آدمی خواہشات میں جکڑا، اس مغالطے میں ہوتا ہے کہ وہ خوشیوں سے قریب ہو رہا ہے لیکن ایک دن ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ فریب اور سراب ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسنے کتنی دیر کشتی چلائی۔ اسکی کشتی ناکامی کے ساحل کو نہیں چھوڑتی۔ وہ زندگی کو خالی اور ناکام چھوڑ دیتا ہے۔

خواہشات اپنی فطرت کے مطابق کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ زندگی گزرتی رہتی ہے۔ وہ زندگی جو دوسرے ساحل پر پہنچ سکتی ہے۔ زندگی جس میں سفر کامیابی سے طے ہو سکتا ہے۔ وہ رائیگاں چلی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کشتی تو سرے سے چلی ہی نہیں۔

ہر ملاح اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے کہ کشتی کو سمندر میں ڈالنے سے قبل لنگر کو کھولنا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کو یہ جاننا چاہئے کہ زندگی کی کشتی کو خوشیوں اور روشنیوں کے سمندر میں ڈالنے سے قبل خواہشات کی زنجیر یا لنگر کو ساحل سے کھول دینا چاہئے۔

گزشتہ دن ایک راہب میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے مراقبے کے ظابطے کے متعلق گفتگو کی۔ ذہن کی فطرت کے متعلق غلط تصورات سنکر انتہائی حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر ہم اس تصور کے ساتھ ابتدا کریں کہ دماغ ہمارا دشمن ہے تو تمام ظابطہ غلط ہوجائے گا۔ نہ تو دماغ ہمارا دشمن ہے اور نہ جسم۔ یہ تو محض ایک وسیلہ ہے جو ہمارے لئے مفید ہے۔ شعور جیسا چاہتا ہے اسے استعمال کرتا ہے۔ دشمن اور مخالفت کا رویہ قدغن بن جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں پوری زندگی زہر ہوکے رہ جاتی ہے۔

انسانی ذہن اپنی فطرت کے بموجب ہمیشہ خوشیوں کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اور اس بات میں کوئی ابہام نہیں۔ یہ اپنی فطرت کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ اگر نہ ہوتو انسان روحانی زندگی کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ ذہن دنیا میں پہلے خوشی ومسرت کا طلبگا رہوتا ہے اور جب اسے وہاں نہیں پاتا تو اندر چلا جاتا ہے۔

خوشی اور روحانی سکون مرکز ہے۔ دنیا اور آزادی دونوں کا مرکز۔ وہ خوشیوں کے اسی محور پر دنیاوی اور دوسری دنیاوی زندگی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔

باہر خوشی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے چنانچہ وہ باہر دوڑ پڑتا ہے۔ مراقبے کے ذریعے خوشی کا یہ ذریعہ واضح ہوجاتا ہے چنانچہ اسکی سمت ذریعے کی جانب ہوجاتی ہے لیکن ذہن کو زبردستی اندر کی طرف نہیں موڑا جاسکتا۔ یہ وہی جبر ہے جسکی وجہ سے ذہن دشمن دکھائی دینے لگتا ہے۔

نہیں۔ خوشی کا ایک نیا پہلو اجاگر ہوجاتا ہے۔ وہ پہلو جیسے ہی وا ہوتا ہے تو ذہن از خود اندر کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اسکی منشا خوشیوں کی طرف جانا ہوتا ہے اور جہاں خوشی ہوتو وہاں قدرتی طور پر راستہ بن جاتا ہے۔

خوشی زندگی کی منزل ہے۔ خوشی، نہ ختم ہونے والی خوشی زندگی کا مقصد ہے۔ دنیا میں جھلک۔ انعکاس ہوتا رہتا ہے۔

اسکی طاقت اسکا ذریعہ آزادی ہے۔ باہر اسکی توسیع، اندر جڑیں۔ دائرے میں اسکی پر چھائیں، درمیان میں اس کی زندگی ہوتی ہے۔ لہٰذا دنیا آزادی کا تضاد نہیں ہے۔ باہر کوئی اندر کا دشمن نہیں۔ پورے وجود کو وسیع پیمانے پر ترتیب دیا گیا ہے۔

جس لمحے یہ حقیقت نظر آجائے، اسی وقت آدمی محکومی سے نکل جاتا ہے۔

صبح کے ابتدائی حصے میں ایک جوان آدمی آیا۔ وہ مایوس اور دل گرفتہ دکھائی دے رہا تھا، ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے تنہائی اور آلام نے اسے گھیر رکھا ہے۔ اور یہ کہ جیسے اسکی کوئی چیز گم ہوگئی ہے اور اسکی نگاہیں اس گم گشتہ چیز کو تلاش کررہی ہیں۔ وہ ایک برس سے میرے پاس آتا رہا ہے اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں بھی جانتا تھا کہ وہ ایک دن میرے پاس اسی کیفیت میں آئیگا۔ آج سے پہلے اس کے اندر ایک تصوراتی مسرت تھی لیکن اب رفتہ رفتہ جاتی رہی ہے۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ جوان شخص نے اپنی آنکھیں بند کررکھی ہیں اور اس بات کا اظہار ہورہا ہے جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر اس نے کھل کر گفتگو کی۔ ''میں نے اپنا اعتماد کھودیا ہے۔ میں خوابوں کی دینا میں تھا جواب درہم ہوچکا ہے۔ میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ اب میں تہارہ گیا ہوں اور الجھن محسوس کرتا ہوں۔ اس سے قبل میں اس درجہ بے یار ومددگار کبھی نہیں رہا۔ میں اب واپس جانا چاہتا ہوں لیکن یہ بھی ممکن نہیں دکھائی دے رہا ہے۔ پل منہدم ہوچکا ہے۔

میں اس سے کہتا ہوں۔ ''جسے ہٹایا جاسکے صرف وہ تھا۔ جو ہے اسے ہٹانا ممکن نہیں۔ تنہائی صرف لاشعور میں ہے۔ اس نے خواب اور تصور کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ نہیں پیدا کی ہے۔ وہ خوشی وہ مسرت جسے تصور کے ذریعے حاصل کیا جائے وہ حقیقی نہیں ہوتی۔ یہ ایک مغالطہ ہے کوئی مدد نہیں۔ ایک شخص جتنی جلدی اس مغالطے سے باہر آجائے وہ بہتر ہے۔

خدا کو حقیقی انداز میں پانے کے لئے تمام ذہنی تصورات کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور استثنائی نہیں، اسے بھی ترک کرنا ہوتا ہے۔ صرف یہی ترک تیاگ ہے اور صرف یہی زہد ہے۔ کیونکہ خوابوں سے نکلنا ہی سب سے بڑی دشواری ہے۔

اس وقت جب تصورات غائب ہوتے ہیں، خواب اور تصورات تو وہ ''جو ہے'' ظاہر ہوتا ہے۔ نیند ختم ہوکر بیداری آجاتی ہے اس کے بعد جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہی حق ہے کیونکہ کوئی اسے چھین نہیں سکتا۔ اور کوئی دوسرا تجربہ اسمیں ابتری بھی نہیں لاتا کیونکہ یہ اسکا اپنا تجربہ ہے۔ یہ کسی منظر کو دیکھنا نہیں اور نہ کسی دوسرے کا تجربہ ہے۔ یہ خود ناظر کو پہچاننا ہے۔ یہ خدا کے متعلق کوئی خیال نہیں بلکہ خدا مل جانا ہے۔

اگر خدا کا خیالی تصور اور امید چھپ جاتی ہے تو گھبرانے کی بات نہیں بلکہ یہی بہتر ہے۔ تمام تصورات کو چھوڑ و اور دیکھو۔

پھر جو کچھ دکھائی دیگا وہ خدا ہوگا

100

ایک دوست نے مجھے کاغذی پھول پیش کئے۔ میں ان پھولوں کو دیکھتا ہوں۔ انمیں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آنکھوں سے دکھائی نہ دے۔ اس میں ہر چیز واضح ہے۔ کوئی چیز غیر واضح نہیں کچھ کھلے ہوئے گلاب ہیں۔ واضح دکھائی دینے کے دوسری طرف کچھ چیزیں ایسی ہیں جو غیر واضح ہیں۔ اور یہ غیر واضح چیز اسکی سانس ہے۔

جدید معاشرت کاغذی پھولوں جیسی ہی ہے۔ دیکھنے میں نظر فریبی اسپر ختم ہے پھر بھی اسمیں زندگی نہیں ہے۔ یہ دکھلائی دینے والے سے اسکا رشتہ ختم ہو چکا ہے یعنی نادیدہ سے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی اس سے الگ ہوگیا ہے۔ وہ خود اپنی جڑوں سے اس طرح جدا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

درخت، اسکی پتیاں، اسکے پھول، اسکے پھل آشکار ہیں لیکن اسکی جڑیں زمین کے اندر ہیں۔ جڑیں نہیں دکھائی دیتیں یعنی پوشیدہ ہوتی ہیں جڑیں جو دیکھی جاسکتی ہیں وہ تمام جڑوں کا اختتام نہیں ہیں۔ کچھ ایسی بھی جڑیں ہیں جنہیں نہیں دیکھا جاسکتا۔ مرکز جہاں زندگی کائنات کی زندگی سے جڑتی ہے صرف وہی نامعلوم نہیں ہے۔ لیکن عقل وفہم سے بالا ہے۔

ایک آدمی نہ دکھائی دینے والے سے جڑ جائے تو وہ حقیقی جڑ پالیتا ہے۔ نہ دکھائی دینے والا خیالات کے ذریعے کبھی نہیں ملتا۔ خیالات کی حدیں دکھائی دینے والی چیزوں پر ختم ہوجاتی ہیں۔ خیال خود ایک معلوم چیز ہے۔ اور وہ چیز جو دکھائی دے رہی ہو وہ کبھی نہ دکھائی دینے والی چیز کے لئے ذریعہ نہیں بن سکتی۔

وجودیت خیالات سے پرے اور افضل و برتر ہے۔

چنانچہ ایک شخص ہستی کو نہ جانتے ہوئے بھی ایک وجود بن سکتا ہے۔

کوئی شخص عام مشاہدہ کرنے والے کی طرح اس سے الگ رہ کر شناسائی نہیں حاصل کرسکتا جب تک کہ وہ اس سے مل کر باہم ایک نہ ہوجائے۔

خیالات کو چھوڑ کے، خاموش اور خالی ذہن سے یک رخی آتی ہے جو ایک شخص کو حقیقت سے ملادیتی ہے یعنی خود اپنے آپ سے۔ اگر کسی شخص کو کاغذی پھول دیکھنا ہو تو وہ اسے فاصلے سے دیکھ سکتا ہے، اس طرح وہ اسکا ناظر بن جاتا ہے لیکن اگر حقیقی پھول دیکھنے ہوں تو ایک شخص کو پھول بننا ہوتا ہے۔

101

ایک بچی رو رہی ہے۔ اسکی گڑیا ٹوٹ گئی اور میں اب سوچتا ہوں ۔ کیا ہم سب لوگوں کا رونا گڑیا ٹوٹ جانے کی وجہ سے نہیں ہے؟ گزشتہ شام ایک بوڑھا شخص مجھسے ملنے آیا تھا۔ اسنے اپنی زندگی میں جو خواہشات کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں ۔ وہ اداس اور غمگین تھا۔ آج میری ملاقات ایک عورت سے ہوئی جو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے بار بار اپنے آنسو پونچھے جارہی تھی ۔ اس کے بہت سے خواب تھے جو پورے نہیں ہوئے۔

اور اب یہ بچی رو رہی ہے ۔ کیا اس بچی کے رونے کا بنیادی عکس دوسرے رونے والوں میں نہیں ہے؟ کیا ان آنسوؤں کا سبب ویسا ہی نہیں جو ٹوٹی ہوئی گڑیا کے باعث بچی کا ہے جو اسکے سامنے پڑی ہوئی ہے؟ کوئی اسے تسلی دے رہا ہے کہ یہ تو صرف ایک کھلونہ تھا اس کے لئے رونا دھونا کیسا ۔ یہ سننے کے بعد میں اپنی ہنسی نہیں روک سکا اگر انسان اس حقیقت سے آگاہ ہو تو کیا اسکا رنج والم ختم نہیں ہوسکتا ؟ اس بات کو سمجھ لینا کس قدر مشکل ہے کہ گڑیا بہر حال ایک کھلونا ایک گڑیا ہے۔

آدمی مشکل سے ہی اتنا بالغ نظر ہوتا ہے کہ بات سمجھ سکے ۔ انسان کی جسمانی پختگی ایک الگ چیز ہے لیکن وہ ذہنی طور پر بالغ ہو دوسری ۔ بالغ نظری یا پختہ کاری ہے کیا؟

آدمی کی بالغ نظری ذہن کا آزاد ہونا ہے۔ جب تک ذہن موجود ہے وہ کھلونے بنا تا رہیگا۔ ان کھلونوں سے چھٹکارا اسی وقت ملے گا جب ایک شخص کا ذہن آزاد ہوجائے۔

102

''میں ایک طالب ہوں ۔ میں روحانی مشق کر رہا ہوں اور اس میں کامیابی ہوتی جارہی ہے ۔ ایک دن منزل مل جائے گی ۔'' ایک بار ایک راہب نے مجھسے یہ بات کہی تھی۔ اس کے الفاظ سے مجھے لگا کہ وہ روحانیت سے زیادہ خواہشات کے دائرے میں ہے ۔ اس قسم کے روحانی ظابطے، روحانیت کے راستے میں بجائے خود کاوٹیں ہیں۔

اس چیز کو حاصل کرنے کی مشق کیسی جو پہلے ہی موجود ہو؟ اسے حاصل بھی نہیں کیا جاتا ۔ صرف یہ جان لینا ہے کہ وہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہوئی اور اس نام نہاد روحانی مشق کی جانکاری نے اس حقیقت کو چھپا رکھا ہے۔ اس کی جڑ میں ایک شخص کی خواہش روحانیت کے برخلاف ہوتی ہے کہ کچھ حاصل کریں یا پھر کوئی تبدیلی لائیں ۔ میں جو کچھ ہوں اس سے تبدیل ہو کر کچھ اور ہو جاؤں ۔ A چاہتا ہے کہ تبدیل ہو کر B ہو جائے یہ دورخی یہ تضاد، انہی جڑوں میں ہوتا ہے۔ یہ دورخی دینا اور رنج والم ہے۔

میں کہتا ہوں ، اگر تم جو کچھ ہو اس سے تھوڑی ہی سہی تبدیلی چاہتے ہو تو تم جو کچھ ہو اس کے خلاف جارہے ہو ۔ اور راستہ کیا ہے ۔ وہ لمحہ جب تم بیداری حاصل کرتے ہو تو تمہاری زندگی قدرتی خوبصورتی سے بھر جاتی ہے ، یہ حسن نام نہاد مشق کرنے والوں کو نہیں مل سکتا ۔ تشدد یا جبر یہ اپنے کسی عمل کو روک دینا فطرت کو ختم کر دینا ہے۔ چنانچہ ان نام نہاد زاہدوں کی حد سے زیادہ خواہشات انتہائی برے نتائج کا حاصل بنتی ہے۔

پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟ کچھ بھی نہیں ۔ کچھ نہ کرو، کوئی چیز مت کرو ۔ صرف مراقبہ کرو ہماری ذات نہ تو کچھ کرتی ہے اور نہ سوچتی ہے۔

103

ایک سبق آموز حکایت ہے۔

ایک بار ایک نوجوان نے راہب سے پوچھا۔"آزادی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟" راہب نے جواب دیا۔"تمہیں کس نے روک رکھا ہے؟ نوجوان تھوڑے سے توقف کے بعد بولا۔"مجھے کسی نے بھی نہیں روک رکھا ہے۔"

راہب نے پوچھا۔"پھر تم آزادی کیوں تلاش کرر ہے ہو؟"

تم آزادی کیوں تلاش کرر ہے ہو؟ یہی سوال میں نے کل ایک شخص سے کیا۔ یہی ہر شخص کوخود سے پوچھنا چاہئے کہ "غلامی اور ہے کہاں؟"

جیسے بھی ہو بیدار ہوجاؤ۔ تبدیل ہونے کی زحمت نہ کرو اچھے تصورات کے پیچھے نہ بھاگو۔ اس وقت تم جو کچھ ہو وہی ہو، جو مستقبل میں ہے وہ نہیں ہو۔ اور زمانہ حال میں کوئی بندش کوئی روک نہیں جب کوئی زمانہ حال میں بیداری اختیار کرتا ہے تو وہاں کسی قسم کی بندش نہیں ہوتی۔

خواہشات۔ کچھ بننے کی خواہش، کچھ حاصل کرنے کی خواہش، بندش اور روک ہوتی ہے۔ خواہش ہمیشہ مستقبل کے لئے ہوتی ہے، ہمیشہ آئندہ کل کے لئے۔ اور وہی بندش اور روک ہے وہی کھنچاؤ کا سبب اور دوڑ ہے، یہی دنیا ہے۔ یہ خواہش ہی تو ہے جو آزادی کا خیال پیدا کرتی ہے۔ اور اگر بندش، روک جڑ میں ہے تو آزادی کیونکر برآمد ہو سکتی ہے؟

حریت کی ابتدا آزادی میں ہے۔ آزادی اختتام نہیں، یہ ابتدا بھی ہے۔

آزادی حاصل نہیں کی جاتی بلکہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ "میں پہلے ہی آزاد ہوں" اس بات سے آگاہ ہونا کہ "میں آزاد ہوں" خاموش، پرسکون صورت حال میں بلا کسی کوشش و کاوش کے مل جاتی ہے جب شعور بیدار ہو۔ ہر شخص پہلے ہی آزاد ہے۔ معاملہ صرف اس حقیقت سے آگاہ ہونے کا ہے۔

وہ لمحہ جب تمام دوڑ بھاگ ختم ہوجائے وہ لمحہ جب کچھ بننے کا مقابلہ نہ ہو رہا ہو تو میں، بن جاتا ہوں۔ اور اپنے پورے مفہوم کے ساتھ "یہی ہونا" آزادی ہے۔

نام نہاد مذہبی لوگ اس مقام پر اس لئے نہیں پہنچتے کیونکہ وہ آزادی کے حصول کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں تا کہ وہ روح تک پہنچ سکیں اور خدا تک اور وہ شخص جو دوڑ میں شامل

ہے، چاہے وہ دوڑ کیسی بھی ہو، وہ خود اپنے اندر نہیں ہوتا۔ مذہبی ہونے کا مطلب ایمان ویقین نہیں۔ مذہبی اس وقت ہوتے ہیں جب خود اپنے اندر ہوں۔ اور یہ آزادی ایک لمحے میں حاصل ہو سکتی ہے۔

وہ لمحہ جب ایک شخص اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ غلامی اور رکاوٹ خواہشمند ہے، دوڑ میں، کاملیت میں تو اندھیرا غائب ہو جاتا ہے اور کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔

حق ایک لمحے میں انقلاب لے آتا ہے۔

یہ سردیوں کی صبح ہے، سورج ابھی ابھی نکلا ہے۔ رات سرد ہوائیں چلی تھیں اور علی الصباح گھاس شبنم کے قطروں سے بھری ہوئی اب سورج کی کرنوں نے اسے ختم کردیا اور اب تمازت بڑھ گئی ہے۔

ایک خوشگوار صبح نے دن کا استقبال کیا ہے پرندوں کے نغمے کتنے بامعنی لگ رہے ہیں۔ لیکن شاید زندگی کے کوئی معنی نہیں اور معنی ومطلب کا تصور خود انسان کا ہوتا ہے۔

اس کے کوئی معنی نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے جو اسمیں لاانتہا گہرائی اور زندگی میں وسعت ہے۔ معنی ومطلب کی حدود ہوتی ہیں۔

زندگی، وجود لامحوود ہے چنانچہ اسکے کوئی معنی نہیں۔ وہ جو بے معنی کے ساتھ ضم ہوکر خود کو لامحدود کرتا ہے، وہ جو وسیع بے معنی بنتا ہے تو اسے وہ حاصل ہوتا ہے ''جو وہ ہے'' تو وہ جینے کا ڈھنگ پالیتا ہے۔

تمام معنی ومطلب حقیر ہوتے ہیں۔ تمام معنی خود پسندی کی پیداوار ہیں۔ خود پسندی ہی ان مطالب کا مرکز ہے۔ وہ دنیا جو اسکے ذریعے دکھائی دیتی ہے وہ حقیقی دنیا نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ''میں'' سےمتعلق ہے وہ حقیقی نہیں۔

حقیقت ناقابل تقسیم مجموعہ ہے۔ اسے ''میں'' اور ''میں نہیں'' میں نہیں بانٹا جاتا۔ تمام مطالب کا تعلق ''میں'' سے ہے اس لئے بانٹا نہیں جاتا۔ ایک ایسا شخص جو ''میں'' اور ''میں نہیں'' سے پرے ہو یعنی بلامعنی ومطلب۔ وہ نہ تو معنی ہوتا ہے اور نہ بے معنی اسے کوئی نام دینا غلط ہے، یہاں تک کہ اسے دیوتا کہنا بھی غلط ہے۔ خدا بھی ''میں'' کے حوالے سے ہے۔ دیوتا بھی ''میں'' کا عمومی تصور ہے۔

مجھے کہنے دو کہ جو کچھ بامعنی ہے وہ حقیقتاً بے معنی ہے بے معنی حدود سے آگے جانا روحانیت پانا ہے۔

کسی نے bodhidharma سے پوچھا۔ ''برائے مہربانی مقدس نروان سے متعلق کچھ بتائیں۔ اس نے جواب دیا۔ ''اس میں کوئی تقدس نہیں۔ ذہن کا خالی پن اور صرف خالی پن۔''

ایک مرغا بانگ دے رہا ہے۔ میں نے سنا۔

سامنے سے ایک گاڑی گزر رہی ہے میں نے دیکھا ہر طرف آوازیں ہیں، ہر طرف ...ظر ہیں لیکن درمیان میں کوئی لفظ نہیں الفاظ ایک شخص کے وجود کو جدا کر دیتے ہیں الفاظ ...یقت کے لئے ہوتے ہیں وہ بجائے خود حقیقت نہیں ہوتے۔ ایک شخص حقیقت تک نہیں ...نچتا۔ اور بے لفظ ہونا سمادھی اور روشن خیالی ہے۔

لیکن صرف بے لفظ ہونا سمادھی نہیں ہے۔ الفاظ لاشعور میں نہیں ہوتے اور نیند کے ...لم میں بھی۔ بے لفظ ہونے کے ساتھ بیدار اور مستعد شعور سمادھی ہے۔

میں یہی بات ایک راہب سے کہہ رہا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنی ذات میں سمانا اور ...ل ہونا سمادھی ہے۔ بہت سے لوگ اس غلطی کی وجہ سے عبادت، پرہیز گاری اور ...عوری بننے کے کئی طریقے رائج ہوگئے ہیں۔ اسکی افادیت ویسی ہی ہے جیسی نشے سے ...صل ہوتی ہے۔ اس میں انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ اس بھول کے باعث، خود کو بھول ...نے سے جھوٹی خوشی پیدا ہوتی ہے جبکہ مراقبہ مکمل خود آگاہی ہے خود فراموشی نہیں۔

جب ایک شخص پوری طرح بیدار ہوتا ہے تو وہ ہوتا ہے کہ میں مکمل طور پر اپنے وجود ...ں ہوں۔ یہ بیداری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ نہیں ہوتے اور نہ ہی خیالات اور ...ن۔ الفاظ سے تہی شعور میں ''میں'' غائب ہوجاتا ہے۔ لیکن میں نہیں چھپتا بلکہ ''میں ...کے غائب ہوتے اور خود پسندی ختم ہوتے ہی میں اپنے وجود میں آجاتا ہوں۔

106

بلا چاند کی اندھیری رات آیا چاہتی ہے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں آچکے ہیں اور اندھیرے میں درختوں پر خاموش ہونے سے پہلے چہچہار ہے ہیں۔ شہرمین چراغ جلائے جارہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں آسمان ستاروں سے بھر جائیگا اور دنیا انکی روشنیوں سے منور ہوجائے گی۔

بادلوں کے دو چھوٹے ٹکڑے مشرقی آسمان پر بہہ رہے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں۔ ذہن میں کوئی سوچ بھی نہیں ، میں بس بیٹھا ہوا ہوں۔ صرف بیٹھے رہنا کتنا پرمسرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آسمان اور ستاروں کی کائنات مجھ میں ضم ہوگئی ہے۔

جب ذہن میں کوئی خیال نہ ہوتی انسان کا وجود کائنات کے وجود میں ضم ہوجاتا ہے ۔صرف ایک چھوٹا سا پردہ ہے ورنہ ہر شخص خود اپنا وجود ہے۔

ہماری آنکھوں پر ایک باریک سا پردہ پڑا ہوا ہے جس نے ہمارے وجود کو چھپا رکھا ہے۔ یہ باریک سا پردہ دینا بن گیا ہے۔ جیسے ہی اس پردے کو ہٹا تے ہیں تو لامحدود خوشیوں کی سلطنت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ نے فرمایا ۔''دستک دو، اور دروازے کھل جائیں گے ۔''میں کہتا ہوں۔ ''بس ایک نظر ڈالو۔ دروازے تو پہلے ہی کھلے ہوئے ہیں۔''

ایک شخص غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اسنے دوسرے شخص سے پوچھا۔ ''مشرق کس طرف ہے؟'' جواب ملا۔ ''صرف مڑکر پیچھے دیکھو، تمہاری آنکھوں کے عین سامنے مشرق ہے۔''

سب کچھ موجود ہے۔ ایک شخص کیا چاہتا ہے، صرف اپنی آنکھوں کو صحیح سمت موڑنا ہے۔

اس بات کو پوری دنیا تک پہنچانا ہے۔ اس طرح کہ لوگ ٹھیک طرح سنیں اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں ۔ مذہبی مطالعے پر یقین ہونا آدھا حاصل کرنے کے مترارف ہے۔

میں نے آج ہی ایک دوست سے کہا جو مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ ''خزانہ پہلے

ہی تمہارے اندر موجود ہے تم صرف اسے بھولے ہوئے ہو۔ صحیح قسم کی یادوں کو یاد کرنے سے تمہیں تمہاری عظمت مل جائے گی ۔ یہ جانو کہ تم کون ہو خود سے پوچھو۔ اپنے آپ سے اس طرح دریافت کرو جیسے یہی معلومات آخری ہیں۔ اس طرح پوچھو کہ تمہارے ذہن اور ہستی کو یہ آواز سنائی دے ۔اس طرح اسکا تیر سیدھے تمہارے لاشعور تک چلا جائیگا۔ اور ایک پراسرار ردعمل از خود تمہارے سامنے موجود ہوگا اس کو جاننا ہر چیز سے واقف ہونا ہے۔''

107

رات نے ابھی تک صبح کو آنے کا راستہ نہیں دیا اور آسمان ابھی تک جاتے ہوئے ستاروں سے بھرا ہوا ہے۔ دریا چاندی کا ایک پتلا سا دھارا دکھائی دے رہا ہے۔ دریا کنارے کی ریت شبنم کے قطروں سے ٹھنڈی ہے اور ہواؤں میں سردی کی کاٹ ہے۔ گہری خاموشی کا راج ہے لیکن کبھی کبھی کسی پرندے کی آواز اس خاموشی کو توڑ رہی ہے۔

ایک دوست کو ساتھ لیکر میں اس سنسان جگہ کچھ پہلے آیا تھا۔ دوست کہتا ہے کہ اسے اس ویرانے میں خوف آرہا ہے اور سکوت جیسے کاٹ رہا ہے۔ اگر وہ خود کو کسی طرح مصروف رکھتا تو اچھا ہوتا وگرنہ ایک انجانی سی تکلیف اور اداسی اسے گھیر لیگی۔

اس قسم کی تکلیف سے ہر شخص دوچار ہوتا ہے کوئی بھی شخص خود اپنی ہستی کے اندر جھانکنے کی جرات نہیں رکھتا، بلکہ الجھن محسوس کرتا ہے اور گمبھیر تنہائی ایک شخص کو اس کے وجود کے ساتھ تنہا کر دیتی ہے۔ اس طرح ڈر محسوس ہوتا ہے۔ اگر تمہاری توجہ کسی دوسری طرف ہو تو اپنا وجود بھول جاتا ہے۔ یہ لاشعور کی ایک قسم اور فرار ہے۔ آدمی اپنی پوری زندگی اسی فرار میں لگا رہتا ہے۔ لیکن یہ فرار محض وقتی ہوتا ہے کیونکہ کوئی ایسا راستہ نہیں کہ ایک شخص اپنی ہستی سے فرار اختیار کرلے۔ اس سلسلے میں اسکی تمام کوششیں بیکار اور رائیگاں جاتی ہیں کیونکہ وہ بجائے خود ایک اور واحد ہے جس سے وہ بھاگنا چاہتا ہے۔ کوئی اپنی ہستی اور وجود سے کیونکر بھاگ سکتا ہے؟ ہم ہر ایک چیز سے بھاگ سکتے ہیں لیکن اپنے وجود سے نہیں بھاگ سکتے۔ ساری عمر دوڑنے بھاگنے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں بھی نہیں پہنچے چنانچہ وہ لوگ جو ذہین ہیں اپنے وجود سے بھاگنے کی سعئ لاحاصل نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے مقابلہ کرتے ہیں۔

اگر ایک شخص اپنے اندر دیکھتا ہے تو اسے خالی پن کا تجربہ ہوتا ہے۔ اسکے اندر لاوجود کی وسعت ہوتی ہے چنانچہ وہ گھبرا کر باہر کی جانب دوڑ پڑتا ہے۔ وہ بے حد حساب کوشش کرتا ہے تاکہ اس خالی پن کو بھر سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس سے پوری دنیا کو بھر دے لیکن یہ کسی بھی طرح نہیں بھر سکتا۔ اسکو بھرنا ممکن ہی نہیں۔ اس طرح وہ اذیت کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔ موت اس اذیت کو صاف طور پر عیاں کرتی ہے۔ موت اسے اسی خالی پن میں پھینک دیتی ہے جس سے وہ ساری عمر بھاگتا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موت کا بے پناہ خوف ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ خالی پن سے فرار حاصل کرنا نادانی اور جہالت ہے۔ اسکا سامنا کرتے ہوئے اسمیں داخل ہونا چاہئے۔ اس لاوجود میں پہنچنے سے قدرت سے شناسائی ہوتی ہے۔

مذہب خالی پن میں پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ انسان اپنے اندر جن تجربات سے گزرتا ہے، وہ شدید تنہائی میں مذہبیت ہے۔

"مثالی زندگی کیا ہے؟" ایک نوجوان نے مجھسے پوچھا۔

رات گہری ہوچکی اور آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہوائیں خنک ہیں، کسی نے کہا کہ پورے علاقے میں ژالہ باری ہورہی ہے۔ راستے ویران اور درختوں کے نیچے گھپ اندھیرا ہے۔ اس خاموش تنہائی میں زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ ایسے ہی پُرمسرت ہونا چاہئے لیکن ہم یہ بھول چکے ہیں کہ کیسے۔

یہ زندگی کتنی پرمسرت ہے لیکن ہم ہیں کہ اسمیں رہنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ جو بجائے خود اختتام ہے۔ ایک مفہوم میں اس تصوراتی زندگی کی دوڑ نے ہر چیز زہر آلود کردی ہے۔ تصوراتی زندگی کے کھنچاؤ نے زندگی کی تمام موسیقی کو آلودہ کردیا ہے۔

ایک بار شہنشاہ اکبر نے تانسین سے پوچھا۔ "یہ کیا بات ہے کہ تم اتنا اچھا نہیں گاتے، جتنا اچھا تمہارا استاد گاتا ہے؟ اسکے گانے میں تقدس ہوتا ہے۔" تانسین نے جواب دیا۔ "میرا استاد صرف گانے کے لئے گانا گاتا ہے جبکہ میں کسی مقصد کے لئے گاتا ہوں۔"

کبھی صرف زندہ رہنے کی کوشش کرو، صرف زندہ رہو۔ زندگی کے ساتھ جدوجہد نہ کرو۔ زندگی پر دباؤ نہ ڈالو۔ خاموشی سے واقعات کو ہوتا دیکھو۔ جو کچھ ہوتا ہے، ہونے دو۔ تمام کھنچاؤ ختم کردو، زندگی کو گزرنے دو۔ اور جو کچھ ہوگا، میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ آزادی ہوگی۔

اندھے اعتماد والے تصورات کا خاتمہ جسکی برسوں سے پرورش کی جارہی ہے۔ زندگی صرف زندہ رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں، نہ کسی چیز کے لئے۔ ایک ایسا شخص جو کسی وجہ سے جیتا ہے وہ حقیقتاً زندہ نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو زندگی گزارتا ہے، حقیقی زندگی، صرف وہی اکیلا پاتا ہے جو چیز پانے کے لائق ہوتی ہے۔ یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی خواہش کے مطابق بھی حاصل کرلیتا ہے۔

میں نے نوجوان پر نگاہیں ڈالیں۔ اسکے چہرے پر حیرت انگیز سکون تھا۔ اسنے ایک لفظ نہیں کہا لیکن سب کچھ بیان کردیا۔ وہ ایک گھنٹے تک قیام پزیر رہنے کے بعد خاموشی سے چلا جاتا ہے، انتہائی پرسکون انداز میں جیسے ایک تبدیل شدہ شخص ہو۔

اس نے جاتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے ایک مختلف شخص کی حیثیت سے جارہا ہوں۔"

یہ صبح ہے۔ سورج بادلوں کے پیچھے ہے، بوندا باندی ہورہی ہے۔ بارش نے ہر چہار جانب خوشگوار احساس پھیلا رکھا ہے۔ ایک بھیگا ہوا راہب مجھسے ملنے آیا ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس برس قبل اس نے اپنا گھربار چھوڑ دیا تھا تاکہ خود آگاہی حاصل کرسکے۔ گھر تو خیر چھوٹ گیا لیکن حاصل حصول کچھ نہ ہوا۔ اس لئے وہ غمگین اور اداس ہے۔ معاشرہ اور عزیز رشتہ داروں نے خود آگاہی کے راستے میں روڑے اٹکائے۔ اس قسم کے یقین واعتقاد نے لوگوں کو اسکی زندگی سے خارج کردیا۔

میں نے اسے ایک کہانی سنائی۔

ایک دیوانی عورت تھی۔ اسے یقین کامل تھا کہ اسکا جسم عام جسموں جیسا مادّی نہیں اور یہ کہ اسکا جسم مقدس ہے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ دنیا میں کسی دوسرے شخص کا جسم اتنا خوبصورت نہیں جیسا کہ اسکا ہے۔ ایک دن اسے ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑا کیا گیا اسنے آئینے میں اپنا جسم دیکھا اور غصہ سے بھر گئی۔ اسنے ایک کرسی اٹھائی اور آئینے پردے ماری، آئینہ ٹوٹ کر ٹکڑوں میں بنٹ گیا۔ اسنے اب اطمینان کی سانس لی۔ جب اس سے آئینہ توڑنے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا۔ "آئینے نے میرے جسم کو مادّی بنادیا تھا۔ اسنے میری تمام تر خوبصورتی ختم کردی تھی۔"

سوسائٹی اور رشتہ داریاں آئینے سے کم نہیں۔ وہ وہی دکھاتے ہیں جو میرے اندر ہوتا ہے۔ آئینے کو توڑ دینا کتنی بے معنی سی بات ہے۔ اسی طرح رشتے داروں کو چھوڑ دینا۔ یہ اپنی ذات ہے، آئینہ نہیں، جسے تبدیل کرنا ہے۔ اور یہ تبدیلی وہیں پر ہونی چاہئے جہاں ایک شخص موجود ہے۔ یہ انقلاب مرکز سے شروع ہوتا ہے۔ کسی دوسرے حصے یا پہلو سے ابتدا کرنا وقت کا زیاں ہے۔

سوسائٹی اور رشتہ دار کسی بھی طرح رکاوٹ نہیں ہوتے۔

اگر کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو ایک شخص کے اندر ہوتی ہے۔

110

''کیا خدا موجود ہے؟'' ہم اس سے ناواقف ہیں۔

''کیا روح کا وجود ہے؟'' ہمیں نہیں معلوم۔

''کیا موت کے بعد زندگی ہوتی ہے؟'' ہم نہیں جانتے۔

''کیا زندگی کا کوئی مفہوم ہے؟'' ہمیں نہیں معلوم آج ہم زندگی کے پورے فلسفے سے ناواقف ہیں۔'' ان تین الفاظ میں ہماری پوری جانکاری ہے۔ جہاں تک مادّے کو جاننے کا تعلق ہے، اسکی دوڑ کا کوئی اختتام نہیں۔ دوسری چیزوں کے لئے فکرمندی ہے لیکن اپنی ذات اور شعور کے سلسلے میں ہم اندھیرے میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔

باہر سے تو لگتا ہے کہ روشنی ہے لیکن اندرونی حصے اندھیری کھائی میں ہیں۔

احاطے کے متعلق تو علم ہے لیکن مرکز سے لاعلمی اور انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ مرکز کو روشن کرنے کے لئے کسی جدوجہد کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔ جیسے تمہاری نگاہیں جہاں پڑتی ہیں وہ سب جگمگا رہا ہے۔ ہمیں صرف اپنی نظریں اپنے اندر ڈالنی ہے جہاں ہر چیز روشن ہے۔

اگر ہماری آنکھیں دوسروں پر نہ ہوں تو اپنی ذات پر کھل سکتی ہیں۔ اگر باہر اسکی اساس نہ ہوتو اسے ذات کے اندر بنیاد مل سکتی ہے۔

ہستی کی بنیادوں پر قائم شعور سمادھی اور روشن خیالی ہے۔

سمادھی حقیقت اور سچائی کا دروازہ ہے۔

اسمیں ایک شخص کو جواب نہیں ملتا بلکہ تمام سوالات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور تمام سوالات کا غائب ہو جانا ہی جواب ہے۔ جہاں سوالات نہیں صرف شعور ہے۔ خالص شعور۔

بغیر یہ جانے اور سمجھے ہوئے، زندگی بیکار ہے۔

111

ایک سرائے میں ایک مسافر ٹھہرا ہوا تھا۔ جب وہ سرائے پر پہنچا تو چند دوسرے مسافر وہاں سے جا رہے تھے۔ دوسری صبح جب وہ سرائے سے رخصت ہو رہا تھا تو کچھ مزید مسافر سرائے میں داخل ہو رہے تھے۔ مہمان کی آمدورفت جاری تھی لیکن میزبان ہمیشہ وہیں رہا۔ ایک راہب نے یہ دیکھا تو پوچھا کیا آدمیوں کے ساتھ روزانہ ایسا نہیں ہوا کرتا؟

یہی سوال میرا بھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ زندگی میں مہمان اور میزبان کی پہچان سے بڑھ کر اور کیا ہے۔

جسمانی ذہن ایک سرائے ہے۔ خیالات، جذبات اور خواہشات مہمانوں کی طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن مہمانوں سے ذرا مختلف کچھ اور بھی ہے۔ میزبان بھی وہیں موجود ہے۔ لیکن یہ میزبان ہے کون؟ اس میزبان کو کیسے پہچانیں؟

بدھا نے کہا ہے۔ ''رکو'' اور یہ رکنا بجائے خود اسے جاننا ہے۔ بدھا کا پورا بیان یوں ہے۔ ''یہ پاگل ذہن نہیں رکتا۔ اگر وہ رک سکتا تو یہ خود روشن خیالی ہوتی۔ وہ خود نروان ہے۔''

ذہن جیسے ہی رکتا ہے تو میزبان خود ظاہر ہو جاتا ہے یہ خالص اور ابدی ہے، بیدار شعور۔ یہ نہ پیدا ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ اسی طرح نہ یہ غلام ہے اور نہ آزاد۔ یہ صرف ہوتا ہے اور اسکا ہونا ہی سب سے بڑی خوشی ہے۔

زندگی۔ہم زندگی کو کیا سمجھتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ گزشتہ رات کسی نے مجھسے یہی سوال کیا تھا۔ میں نے اسے ایک کہانی سنائی۔

ایک بار ایک جوان اور ایک بوڑھا شخص، انتظارگاہ میں آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھے شخص نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں لیکن وقفے وقفے سے مسکرا رہا تھا۔ اور کبھی کبھی حرکات وسکنات سے ایسے اشارے کر رہا تھا جیسے کسی چیز کو اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

جوان شخص سے نہ رہا گیا اور اسنے پوچھ ہی لیا۔ ''اس گندے ویٹنگ روم میں ایسی کیا چیز ہے جو تم مسکرا رہے ہو؟ بوڑھے شخص نے جواب دیا۔ ''میں خود کو ایک کہانی سنا رہا ہوں۔ اس کہانی میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن پر مجھے ہنسی آرہی ہے۔'' جوان آدمی نے پھر پوچھا۔ ''اور وہ کیا چیز ہے جسے تم ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تاثرات سے، خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' بوڑھے شخص نے ہنسنا شروع کر دیا اسکے بعد کہا۔ ''یہ وہ کہانیاں ہیں جسے میں بارہا سن چکا ہوں۔''

جوان شخص نے کہا۔ ''اسکا مطلب ہے کہ تم اس کہانی کے ذریعے خود کو تسلی دے رہے ہو۔'' اس بات کے جواب میں بوڑھے آدمی نے کہا۔ ''میرے بیٹے، ایک دن تمہاری سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ زندگی کچھ بھی نہیں سوائے کہانیوں سے دلاسہ دینے کے۔''

یہ ایک سادہ سی بات ہے کہ ہم جسے زندگی سمجھتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سوائے ایک کہانی کے۔ اور ایک شخص کا کہانی سے بہلنا ویسے ہی ہے جیسی ہماری زندگی ہے۔ ہم جسے زندگی سمجھتے ہیں وہ زندگی نہیں بلکہ ایک خواب ہے۔ ہم جب بیدار ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ خالی ہیں۔ زندگی میں جو کچھ بھی تھا وہ حقیقت نہیں تھی وہ صرف نظر آرہی تھی کہ ہے۔

لیکن زندگی کے اس خواب سے بیدار ہو کر حقیقی زندگی میں آنا ممکن ہے۔ نیند ختم کی جاسکتی ہے اور جو شخص سو رہا ہے بیدار ہو سکتا ہے۔ جب خوب غفلت میں ہونا ممکن ہے تو بیدار ہونا بھی ممکن ہے۔

اس وقت تقریباً آدھی رات ہے۔ کئی دنوں بعد آج آسمان صاف ہے۔ ہر ایک چیز تازہ غسل کی ہوئی لگ رہی ہے اور آدھا چاند مغربی افق میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا ہے۔

آج شام میں نے جیل میں تقریر کی۔ بہت سارے قیدی موجود تھے۔ وہ کتنے سادہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جب ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تو وہ کتنی خالص لگتی۔ وہ سب کچھ مجھے یاد آرہی ہیں۔

وہاں میں نے کہا۔ ''خدا کی نگاہوں میں کوئی گنہگار نہیں کیونکہ روشنی کی موجودگی میں اندھیرا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں تم سے کسی چیز کو ترک کرنے کے لئے نہیں کہتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ گرد وغبار جھاڑدو۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ تم ہیرے کو حاصل کرلو۔ تم ہیرے کو حاصل کرو تو گندگی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ جو لوگ تم سے یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز ترک کردو، وہ نادان ہیں۔ دنیا کا مکمل وجود اس مقصد کے لئے ہے کہ تم حاصل کرو۔ جب کوئی شخص سیڑھی پر ایک نیا قدم اٹھاتا ہے تو اس سے پہلے اٹھایا ہوا قدم خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کو ترک کرنا منفی انداز ہوتا ہے۔ اگر کسی چیز کو زبردستی ترک کیا جائے تو یہ تکلیف دہ عمل ہوتا ہے جبکہ کسی چیز کو حاصل کرنا مثبت۔ اس میں خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔

کسی عمل کو ترک کرنا پہلا قدم لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ حاصل کرنا ہی پہلا قدم ہے۔ سیڑھی پر پہلا قدم چھوڑتے ہی دوسرا حاصل ہو جاتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے بعد، اسے تسلیم کرنے کے بعد وہ حاصل ہو چکا ہوتا ہے اور پہلا قدم ختم ہو چکا ہوتا ہے چنانچہ اگر تم تقدس حاصل کرلو تو تمام گناہ، تمہاری کسی کوشش کے بغیر جاتے رہیں گے۔

بے شک، اس ایک چیز کے حاصل ہوتے ہی سب کچھ حاصل ہو جائیگا۔ اسی لمحے جب حقیقت کو ہم پاتے ہیں تو تمام خواب ازخود غائب ہو جاتے ہیں۔ خواب کو ترک نہیں کرنا ہوتا صرف اسکو جاننا ہوتا ہے۔ جو شخص خود کو خواب ترک کونے میں منہمک رکھتا ہے۔ وہ دراصل یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہی حقیقت ہے۔ ہم اسکے حقیقی ہونے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں aham brahmasmi یعنی ہم برہمن ہیں۔'' وہ جو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، انکے لئے اندھیروں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

''دوستو، اس بات کو سمجھو۔ اپنے وجود کے اندر روشنی پیدا کرو اور اپنے اندر ہی تقدس کا

تجربہ کرو۔ اپنی حقیقت کو بیدار کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تاریکی تو کہیں بھی نہیں ہے۔ ہمارا اپنا لاشعور تاریکی ہے ہماری بیداری روشنی بن جائے گی۔''

میں نے یہ بات تو قیدیوں سے کی تھی لیکن سوچا کہ سب ہی لوگوں تک پہنچادی جائے۔ ان لوگوں تک جو قیدی نہیں ہیں۔

114

آج میں ایک سیمینار میں تھا۔ لیکن میری موجودگی ایسے ہی تھی جیسے غیر موجودگی۔ میں اس میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ میں صرف ایک سامع تھا وہاں میں نے جو کچھ سنا وہ معمولی باتیں تھیں لیکن میں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ غیر معمولی چیزیں تھیں۔

وہاں ہر خیال پر بحث ہوئی میں نے ساری باتیں سماعت کیں لیکن جو بات واضح ہوئی وہ کچھ اور ہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دلائل ''میں'' کے متعلق تھے۔ ''آئیڈیاز اور اشو'' پر نہیں تھے۔ کوئی بھی آدمی کسی چیز کو ثابت کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا سوائے ''میں'' کی تشریح کے۔

تمام گفتگو صرف ''میں'' کی بنیادی جڑوں تک محدود تھی۔ اس سے کوئی تعلق نہیں کہ اسکا مرکز سطح پر کہاں نمودار ہوگا۔ بالواسطہ طور پر وہ ہمیشہ ''میں'' میں ہوتا ہے۔

جڑیں ہمیشہ بالواسطہ ہوتی اور وہ کھائی دیتیں ہیں۔ جو دکھائی دیتی ہے وہ جڑ نہیں ہوتی۔ دیکھائی دینے والی چیزیں پھول اور پتیاں ہیں جو ثانوی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی دکھائی دینے والی چیز پر گفتگو کرے تو اس سے کسی نتیجے پر نہیں پہنچا جاسکتا کیونکہ خرابی وہاں نہیں ہوتی۔ مسئلے کا حل وہیں ہوتا ہے جہاں مسئلہ موجود ہوتا ہے۔ اس لئے گفتگو کا کوئی نتیجہ آمد نہیں ہوا۔ اور انکی وجوہات کا۔ یہاں تک کہ ہم نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جہاں جڑیں ہوتی ہیں۔

اسے بھی دیکھنا چاہئے کہ گفتگو کرنے والوں نے حقیقتاً دوسروں کے متعلق کوئی بات نہیں کی ہر شخص اپنے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ بس یہی دکھائی دے رہا تھا کہ کوئی گفتگو ہو رہی ہے۔ جہاں ''میں'' ہے وہاں ایک دیوار بھی تھی جو دوسروں تک پہنچنے میں دشواری پیدا کر رہی تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے ''میں'' کو لیکر اسکے وجود تک پہنچا جائے۔

اس لئے دنیا کے زیادہ تر لوگ خود اپنی ذات سے مکالمہ کرتے ہوئے زندگی گزار دیتے ہیں۔

میں نے پاگل خانے میں ایک واقعے کا مطالعہ کیا تھا۔ دو دیوانے ایک گفتگو میں منہمک تھے۔ ڈاکٹر ایک چیز دیکھ کر حیران تھا۔ دونوں واقعی گفتگو کر رہے تھے۔ جب ایک پاگل بولتا تھا تو دوسرا خاموشی سے سنا کرتا تھا۔ لیکن انکی بات چیت میں کوئی تسلسل، کوئی تعلق

نہیں ہوتا تھا۔ اس نے انسے پوچھا۔ ''جب تم غیر مربوط انداز میں بولتے ہوتو دوسرا خاموش کیوں ہوجاتا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''ہم گفتگو کے آداب سے واقف ہیں۔ جب ایک شخص بات کررہا ہوتو دوسرے پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہے۔''

یہ بات حقیقت پر مبنی اور سچی ہے صرف پاگلوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر ایک شخص کے لئے۔ ہم آداب گفتگو کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں لیکن پھر ہر شخص اپنے وجود سے باتیں کرتا ہے۔

''میں'' کو ایک طرف کئے بغیر دوسروں سے گفتگو کا کوئی طریقہ نہیں۔ اور ''میں'' صرف محبت میں ہی غائب ہوتا ہے چنانچہ بات چیت صرف محبت میں ہی ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ استدلال سب کچھ ہے۔ اور بحث جنون ہے کیونکہ اس میں ایک شخص دوسرے سے سب کچھ کہلاتا ہے۔

جب میں اس سیمینار سے رخصت ہورہا تھا تو ایک شخص نے مجھ سے کہا۔ ''سر، آپ نے کوئی بات نہیں کی'' میں نے جواب دیا۔ ''بات تو کسی نے بھی وہاں نہیں کی۔''

115

میں خواب سے ابھی ابھی بیدار ہوا ہوں ۔ بیدار ہوتے ہوئے میں نے ایک سچائی دیکھی تھی ۔ خواب میں میں شریک حصہ دار اور ساتھ ہی ساتھ دیکھنے والا بھی تھا۔ میں جب تک خواب دیکھتا رہا دیکھنے والا بھولا ہوا تھا اور صرف شریک حصہ دار رہ گیا تھا۔ اب جبکہ میں بیدار ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہاں صرف دیکھنے والا ہے شریک حصہ دار محض عزت افزائی تھی۔

خواب اور دینا، دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ دیکھنے والا صرف شعور۔ وہی حق اور سچ ہے۔ دوسری چیزیں تصوراتی ہیں۔ ہم جو کچھ ''میں'' کے متعلق جانتے ہیں وہ حقیقی نہیں ۔ وہ شخص جو اس ''میں'' کو جانتا ہے، وہ حق ہے۔

ہر چیز کو دیکھنے والا ہر چیز سے آزاد اور سب سے آگے ہے۔ نہ اس نے کبھی کچھ کیا اور نہ اس کے ذریعے کچھ ہوا۔ وہ صرف ہے۔

جب غیر حقیقی ''میں'' خواب کا ''میں'' اپنا وجود کھوتا ہے تو وہ جو ہے آشکار ہوتا ہے۔ اس کو حقیقی جاننا آزادی یا liberation ہے۔

116

ایک راہب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔ ''میں نے خدا کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے اور اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔''

میں سمجھتا ہوں کہ اس نے حقیقتاً کچھ نہیں چھوڑا لیکن میں نے اس سے کہا کہ اس کے پاس اب ایک چیز موجود ہے جو اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ آخری چیز بھی چھوڑ سکتا ہے۔

وہ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ سچ مچ اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ سوائے اسکے اندر کی چیز کے۔ وہ اسکی آنکھوں میں ہے یہ اس کے ترک تیاگ میں ہے۔ وہ اس کے سنیاس میں ہے یہ اسکا ''میں'' ہے۔ ملکیت سے دست برداری ہے، پرہیزگاری ہے۔ جس کے لئے ہر چیز ہٹادی جاتی ہے اور بالآخر موت ہر چیز کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ صرف ''میں'' ہوتا ہے جسے کوئی بھی جدا نہیں کر سکتا یہاں تک کہ موت بھی اسے کہیں دور نہیں لے جا سکتی۔ اسے صرف چھوڑا جا سکتا ہے۔ اسے ختم نہیں کر سکتے۔ اور وہ ترک تیاگ جسے ختم نہ کیا جا سکے وہی حقیقی ترک تیاگ ہے۔

چنانچہ انسان کے پاس ''میں'' کے سوا کچھ نہیں جسے پیش کیا جا سکتا ہو۔ دوسری چیزوں کا ترک محض فریب ہے۔ کیونکہ دوسری چیزوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں اس کے برخلاف دوسری چیزوں کا ترک خود پسندی کو مزید پختہ کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اپنے ''میں'' کے مرکز سے اپنی زندگی بھی پیش کرتا ہے تو یہ بھی کوئی پیش کش نہیں۔ سوائے ''میں'' کو پیش کرنے کے کوئی پیش کش اہمیت نہیں رکھتی۔

''میں'' ہی صرف ملکیت ہے۔

''میں'' ہی دنیا ہے۔

وہ شخص جو اسے ترک کرے تو وہی بے ملکیت ہے، ایک سنیاسی۔

''میں'' دنیا ہے۔

''میں'' کی نفی، سنیاسی ہے۔

''میں'' کو ختم کر دینا ہی حقیقی روحانی انقلاب اور قلب ماہیت ہے کیونکہ یہ ''میں'' نکلنے سے بننے والی جگہ میں ہوتا ہے۔ جس جگہ وہ آتا ہے وہ میرا ''میں'' نہیں بلکہ سب کا ہے۔

میں سائمن ویل کے اس بیان کو پسند کرتا ہوں جس میں اس نے کہا ہے کہ صرف

خدا ہی کی ذات ہے جو خود کو ''میں'' کہہ سکتی ہے۔

بے شک صرف وہ جو ساری کائنات کا محور ہے وہی خود کو ''میں'' کہہ سکتا ہے۔ لیکن ایسی کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود کو ''میں'' کہے کیونکہ اسکے لئے تو ہر اایک چیز ''میں'' ہے۔ وہ ذات جسے ایسا کرنے کا مکمل حق ہے اسکے پاس کوئی وجہ نہیں۔ اور جس کے پاس ''میں'' کہنے کی وجہ ہے اسکے پاس یہ کہنے کا حق نہیں۔

لیکن انسان اسے ترک کر کے اس حق کو پا سکتا ہے جیسے ایک شخص ''میں'' ہونے کو ترک کرتا ہے، وہ ''میں'' ہو سکتا ہے۔ اپنے مرکز سے اس خام خیالی کو نکالنے کے بعد وہ صحیح مرکز پا سکتا ہے۔

اس لمحے جب وہ اپنے مرکز کو لامرکزیت میں منتقل کرتا ہے، اس وقت وہ حقیقی مرکز پالیتا ہے۔

آدمی کا ''میں'' حقیقی نہیں ہے۔ یہ مختلف اجزا پر مشتمل مرکب ہے۔ اسکا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے۔ یہ مخلوط ہے۔ اس مرکب سے جو فریب جنم لیتا ہے۔ وہ جہالت ہے۔ لیکن وہ شخص جو اجزا کے اجتماع میں حقیقت کو تلاش کرتا ہے تو یقین کا فریب چھنٹ جاتا ہے اور ''میں'' کے باغ کے تمام پھول ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔ اور اس وقت حقیقت کی ڈوری ہاتھ لگ جاتی ہے۔

اور فریب دینے والے پھولوں کو حقیقی پھول ڈھانک دیتے ہیں۔

اُن پھولوں کو ختم کرنے کے بعد انکا قائم کردہ غلاف (کور) ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انکی بنیاد صرف میری بنیاد نہیں۔ یہ میرے اندر ہے وہ پورے وجود سے گزرتا ہے۔

ایک ایسا شخص جو ''میں'' کی موت سے نہیں گزرتا، وہ ناکام رہتا ہے۔ ''میں'' کی موت ہماری خدا سے دوری اور علیحدگی کی موت ہے۔ حقیقت اور وجود سے اس کے ساتھ ساتھ اس دوری سے جو ہمیں ہماری ہستی سے جدا رکھتا ہے۔ خدا کا کرم اسی شخص پر ہوتا ہے جو اس موت کو اپنی جسمانی موت سے قبل قبول کرتا ہے۔

وہ شخص جو حق کی تلاش میں ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ تصورات کو قبول نہیں کرنا ہے، کسی بھی سچائی کا تصور، کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو اسکی روحانی تک ودو اپنی موت آپ مرجائے گی۔

حق کو پانے کے لئے ایک شخص میں اتنی جرات ہونی چاہئے کہ وہ دماغ میں موجود تمام وسوسوں کو رد کردے۔ دماغ اگر کوئی نعمل البدل پیش کرے تو اسے بھی تسلیم نہیں کرنا چاہئے ایسی صورت میں نعمل البدل سے آگے ایک کیفیت پیدا ہوگی جو ایک ہستی پر ایک ہستی آشکار کریگی۔

اس متبرک گھڑی کے آنے سے قبل جب پوری خالص حقیقت آشکار ہو، ایک شخص کے راستے میں بہت سی ایسی چیزیں ملیں گی جسمیں حقیقت نہیں ہوگی۔ اور جو بھی ان راستے کی چیزوں میں الجھا وہ کچھ اور تو پاسکتا ہے لیکن اپنی ذات تک نہیں پہنچ سکتا۔ ذات کو جانکاری کے مادے کے حیثیت سے نہیں جانا جاتا اس لئے جب تک اس جانکاری کا سراغ نہ ملے، دیگر ملنے والی اشیاء ''دوسری چیزیں'' ہونگی، ہستی نہیں۔ جب جانکاری کا مادہ نہ ہوتو وہاں موجود چیزیں علم ہوگا، ذات ہوگی، حقیقت ہوگی۔

rinzai نے کہا ہے۔ ''اگر روشن خیالی کے راستے میں تم بھگوان کو بھی پاؤ تو اسے اپنے راستے سے ہٹادو۔''

میں بھی یہی کہتا ہوں۔ جب روشن خیالی کا راستہ غیرآباد ہو، اور جب علم کے دھارے میں کوئی جانکاری کا مادہ نہ ہو، اور جب دیکھنے کے لئے کوئی چیز نہ ہوتب ہی تم مقصد مراد پاؤ گے اور جانو گے کہ حقیقت اور سچائی کیا ہے۔

ایک دوسرے گرو نے ایک بار یہی بات کہی تو اسکے ایک شاگرد نے یہ سنتے ہی آشرم میں جاکر تمام بت توڑ دئے، اسکے سارے صحیفے نذرآتش کردئے۔ اور پھر گرو کے پاس واپس آکر کہا۔ ''میں نے وہ تمام چیزیں برباد کردی ہیں جو حقیقت اور سچائی کے راستے کی رکاوٹ تھی۔''

یہ سننے کے بعد گرو نے کہا۔ ''تم بے وقوف لڑکے! تم ان کتابوں کو نذرآتش کرو جو تمہارے اندر موجود ہے اور ان بتوں کو توڑو جو تمہارے ذہن میں استادہ ہیں۔''

ایسا ہی ایک واقعہ آج یہاں بھی رونما ہوا۔ میرے خیالات سے متاثر ہوکر ایک جوان شخص نے اپنی عبادت کی جگہ توڑ ڈالی اور یہاں آنے سے پہلے تمام بتوں کو پھینک دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بتوں کو پھینکنے کی بجائے اپنے دماغ اپنے ذہن کو پھینکو جو بت پیدا کرتا ہے۔ اور عبادت کے مقام کو تباہ کرنے سے کیا حاصل ہوگا کہ دماغ تو عبادت کی ایک نئی جگہ پیدا اور بت تعمیر کریگا۔

118

کوئی شخص مجھ سے مذہب کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''مذہب کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ تم کس بات کو سچ سمجھتے ہو یا تمہارا یقین کس بات پر ہے۔ یہ اسی وقت بامعنی ہوتا ہے جب وہ تمہاری سانسوں میں رچ بس جائے۔ یہ نہیں کہ اس پر تمہارا بھرپور اعتماد، اعتقاد یا یقین اور ایمان ہے۔ یہ کچھ دوسری چیز ہے جسے تم کرتے ہو یا نہیں کرتے۔ جو تم یا تو ہو یا نہیں ہو۔ مذہب عمل کا نام ہے، محض گفتگو کا نہیں۔

''اور مذہب صرف تمہارے عمل سے آشکار اور عیاں ہوتا ہے جب وہ پہلے تمہارا جوہر بن جائے۔ ہمارا عمل پہلے ہمارا ہونا ہے۔ اس کی خوشبو پھیلنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ وہ پھول بنے پھول کی کاشت کی طرح اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ روح کی بھی کاشت کی جائے۔

اور روح میں پھول کھلانے کے لئے پہاڑوں پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے اسی جگہ کاشت کیا جا سکتا ہے جہاں تم موجود ہو کیونکہ تم پہاڑوں پر بھی ہو سکتے ہو، یعنی جہاں بھی موجود ہو۔ ایک کی ہستی کے اندر پہاڑوں اور جنگلات کی تنہائی ہوتی ہے۔''

یہ ایسے ہی ہے۔ حقیقت اور حسن مکمل تنہائی میں ہی دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ جن میں تنہا ہونے کی جرات ہوتی ہے وہی پاتے ہیں جسے عظیم کہا جاتا ہے۔ گہرائی میں موجود زندگی کی خفیہ باتیں اپنا در صرف تنہائی میں ہی کھولتی ہیں۔ اور روح محبت سے بھر اور روشنی سے منور ہو جاتی ہے۔ صرف اس وقت جب مکمل خاموشی اور سکون ہو، اس وقت وہ بیج جو ہماری ہستی کی مٹی میں کافی نیچے پڑے ہوئے ہیں برگ وبار لے آتے ہیں جس میں ہماری خوشی و مسرت موجود ہوتی ہے۔ اسکی افزائش اور بڑھوتری اندر سے باہر کی جانب صرف تنہائی میں ہی ہوا کرتی ہے۔ یاد رکھو سچائی اندر سے پھیلتی پھولتی ہے۔ نقلی پھول باہر سے تھونپے جا سکتے ہیں لیکن جہاں تک حقیقی پھولوں کا تعلق ہے وہ اندر سے بڑھتے ہیں۔

اس اندرونی بڑھوتری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تم پہاڑوں یا جنگلات میں نکل جاؤ لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنی اندرونی جگہ رہا جائے۔

وہاں پہنچنے کا راستہ ہر ایک شخص کے اندر موجود ہے۔

اپنی روزمرہ کی مصروفیات سے تھوڑا سا وقت نکالو اور اپنے اردگرد کی جگہ اور وقت کے

تصور کو یکسر فراموش کر دو، اسی طرح اپنی نام نہاد شخصیت کو اور ''میں'' کو جو اسی کی پیداوار ہے۔ اپنے دماغ کو فضولیات سے خالی کرو۔ جو کچھ بھی تمہارے دماغ میں آئے تو سمجھ لو کہ یہ تم نہیں ہو اور اسے باہر پھینک دو۔ سب کچھ نکال پھینکو۔ ہر ایک چیز تمہارا نام تمہارا ملک، تمہارا خاندان، سب چیزوں کو اپنے حافظے سے نکال کر کورے کاغذ کا ورق بن جاؤ۔

یہ راستہ ہمارے اندر کے اکیلے پن اور تنہائی کا راستہ ہے۔ اسی کے ذریعے اندرونی سنیاس حاصل ہوتا ہے۔

جب اپنے دماغ سے ننھی تمام چیزوں کو ختم کر دیا جائے تمام رکاوٹیں توڑ دی جائیں تو جو کچھ بچے گا وہی تمہاری حقیقی ہستی ہوگی۔ اس لمحے میں تم اکیلے اور تنہا ہو گے۔

اس وقت تمہارے علم میں جو باتیں آئیں گی وہ اس دنیا سے متعلق نہیں ہونگی۔

اس کے علم میں آتے ہی مذہب کا پھول کھل اٹھے گا اور زندگی تقدس کی خوشیوں سے بھر جائے گی۔

ان چند لمحات میں جو کچھ معلوم ہوگا۔ خاموشی حسن، سچائی۔ وہ تمہیں زندگی کی قوت فراہم کریں گی کہ تم ایک ساتھ دو سیاروں میں رہ سکو۔ پھر تم دنیا میں تو ہو گے لیکن تم دنیا کے آدمی نہیں ہو گے۔ اس طرح ساری محکومیاں ختم ہو جائیں گی اور زندگی آزاد ہو جائے گی۔ تم پانی میں ہو گے لیکن تمہیں پانی نہیں چھو سکے گا۔

اس تجربے سے زندگی بھرپور ہوگی اور مذہب پا جاؤ گے۔

وہی سچائی کے راستے پر ہے جس نے کٹر پن کے اصولوں اور شعائر سے اجتناب کیا۔
ایک ایسا شخص جو چند عقائد کو ترجیح دے کہ وہ اسکے معاون ہونگے، تو سچائی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ تمام ترجیحات آدمی کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ سچائی غیر جانب دار ہے۔ چنانچہ وہ شخص جو غیر جانبدار ہے، اور اس کے پاس کوئی ترجیح نہیں ہے وہ سچائی تک پہنچ جاتا ہے اس کے ساتھ اس پر اسکی دسترس ہوتی ہے۔

چنانچہ کسی ترجیح کی طرف نہ دیکھو۔ کسی مسلک اور طریقہ عبادت کے طلبگار نہ بنو، نہ ہی کسی اسکول آف تھاٹ کی تمنا کرو۔ بلکہ اپنے دماغ کو اس مقام پر پہنچنے دو جہاں کوئی ترجیح نہ ہو۔ یہ وہ مقام ہوگا جہاں تمام خیالات اپنا وجود کھودینگے اور بصیرت شروع ہوجائے گی۔

جب آنکھوں میں غیر جانبداری پیدا ہوجائے گی تو وہ اس قابل ہوجائیں گی کہ وہ دیکھیں "جو ہے۔"

ایک سچا مذہبی شخص وہ ہے جو تمام مذاہب سے الگ ہو۔ جس کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو۔ چنانچہ مذہب سے الگ ہو کر ہی مذہبی ہوا جاتا ہے۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرا کونسا مذہب ہے۔ میں جواب دیتا ہوں۔ "میں ایک مذہبی شخص ہوں لیکن میرا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہے۔" بہت سے مذاہب ہوسکتے ہیں لیکن میں کسی مذہب کو نہیں سمجھ پایا۔ خیالات اختلافات پیدا کرتے ہیں۔ لیکن خیالات کسی کو مذہب کی طرف نہیں لے جاتے۔ یہ خیالات نہیں ہوتے۔ جو کسی کو مذہبی بنائیں۔ جہاں خیالات نہ ہوں وہاں اختلاف بھی نہیں ہوتا۔

ایک تو روشن خیالی ہے اور اس کیفیت میں ہم جس سچائی سے آگاہ ہوں، وہ بھی ایک چیز ہے۔ سچائی ایک ہے اگرچہ عقائد بہت سے۔ وہ جو ان عقائد میں سے کسی کا انتخاب کرتے وہ اپنے ہاتھوں سے سچائی کا دروازہ بند کردیتا ہے۔ عقائد کو کھلا چھوڑ دو اور خود بھی انسے آزاد ہوجاؤ، پھر سچائی کا دروازہ کھولو۔ میری تعلیمات بس یہی ہیں۔

وہ چاہے مشرق ہو یا مغرب، سمندر کا مزہ ہر جگہ ایک ہی ہے۔ قانون تغیر مختلف ممالک میں مختلف نہیں ہوتا موت وحیات کا قانون سب کے لئے ایک ہی ہے۔ پھر ہماری اندرونی ہستی کیونکر سچائی کے مختلف قوانین کے تحت چل سکتی ہے؟

روح کی دنیا میں کوئی جغرافیائی حدود نہیں چنانچہ ہدایات میں بھی کوئی اختلاف نہیں اور وہاں سرحدیں بھی نہیں ہیں۔ اختلافات کا محور ذہن اور دماغ ہے اور وہ شخص جو ذہنی طور پر بٹا ہوا ہو وہ روح کی تقسیم ناپذیری تک نہیں پہنچ سکتا۔

میں جب صبح کی واک سے واپس آرہا تھا تو میں نے ایک پرندے کو پنجرے میں بند دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے لوگ یاد آئے جو تعصب اور جانبداری کے قید خانے میں بند ہیں۔ تعصب اور جانبداری بھی ایک پنجرہ ہے، انتہائی پر اسرار اور خود تعمیر کردہ انہیں ہم خود ہی بناتے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں وہ خود اپنی بنائی ہوئی جیل ہے۔ ہم پہلے اسے بناتے ہیں، پھر خود کو اسمیں قید کرکے سچائی کے آسمان پر پرواز کی طاقت کھودیتے ہیں۔

میں نے ابھی ابھی ایک پتنگ دیکھی ہے جو آسمان پر اڑ رہی ہے۔ کیا آزادی ہے۔ محکومی سے آزاد اسکی اڑان ہے۔ ایک پرندہ ہے جو پنجرے میں بند ہے۔ ایک دوسرا پرندہ کھلے آسمان میں اڑان بھر رہا ہے۔ کیا دونوں پرندے ہماری ذہنی کیفیت کی علامت نہیں ہیں؟

ایک پرندہ جو آسمانوں میں اڑ رہا ہو، اپنے نقش پا نہیں چھوڑتا، نہ ہی اسکے پیچھے کوئی راستہ بنتا ہے۔ ایسا ہی سچائی کے آسمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو آزاد ہوں وہ اسمیں پرواز کرتے ہیں اور انکے پیچھے کسی قسم کا نقش پا نہیں بنتا اور نہ ہی کوئی راستہ بنتا ہے۔

چنانچہ یاد رکھو سچائی کے لئے کسی بنے بنائے راستے کی تلاش محض فضول ہے۔ ایسا کوئی راستہ نہیں اور یہ اچھا ہی ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ پہلے سے بنایا راستہ تمہیں صرف غلامی کی طرف لے جائے گا۔ وہ آزادی کیسے دلا سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو سچائی تک پہنچنے کا راستہ خود بنا ہوتا ہے۔

مترجم کی دوسری کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
1	اینمل فارم	جارج آرویل
2	چارلس ڈارون کی خودنوشت	چارلس ڈارون
3	خوش رہنے کا فن	دلائی لامہ
4	تساوو کے آدم خور	کرنل جے ایچ پٹرسن
5	عام سے لوگ	نجیب محفوظ
6	چور اور کتے	نجیب محفوظ
7	حضرت سلیمان کا خزانہ	رائیڈر ہیگرڈ
8	گرور جنیش	وسنت جوشی
9	دامِ فریب	جیمز ہیڈلے چیز
10	جین ڈکسن	جین ڈکسن
11	چھٹکارا	ژاں پال سارتر
12	الکیمسٹ	پاؤلوکوئیلہو
13	ویرونیکا کی خودکشی	پاؤلوکوئیلہو
14	عظیم وراثت اور 6 مختصر کہانیاں	چارلس ڈکنز
15	شیکسپئر کہانیاں	شیکسپئر
16	عقل و شعور	گرور جنیش